اکتوبر ۱۹۷۹ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۲۸	اکتوبر ۱۹۷۹ء	عدد ۱۰

مشمولات

صفحہ

✱ عرض احوال	مرتب	۱
✱ امثال القرآن	ڈاکٹر اسرار احمد	۴
✱ منصب رسالت اور اس کا مقصد	ڈاکٹر اسرار احمد	۹
✱ سیرۃ نبوی قرآن کریم کی روشنی میں	مولانا وصی مظہر ندوی	۳۲
✱ اخلاق نبوی	سید خورشید احمد گیلانی	۴۰
✱ اسلام — ایک مکمل ضابطہ حیات	محمد یونس جنجوعہ	۵۸

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت : ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور

(فون : 852683 - 852611)

چندہ سالانہ -/۲۰ قیمت فی پرچہ -/۲

موت العالم موت العالم

انا للہ و انا الیہ راجعون

'میثاق' کی کاپیاں حوالہ پریس کی جا چکی تھیں کہ اچانک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بانی جماعت اسلامی کے سانحہ ارتحال کی اندوھناک خبر پہنچی - مولانا بلاشبہ اس صدی کے نابغہ عصر اشخاص میں اس لحاظ سے - سب سے ممتاز تھے کہ انھوں نے نہ صرف اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے انقلابی فکر پیش کی بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک تحریک برپا کی اور ایک مدت تک اس کی قیادت کے فرائض بھی سر انجام دئے -

مولانا مرحوم کی عظمت کے لیے جتنے بھی الفاظ استعمال کئے جائیں - کم ہیں - تمام عالم اسلام بالعموم اور مسلمانان برصغیر پاک و ہند بالخصوص ان کی کمی کو دیر تک محسوس کریں گے - قرآن مجید سے نئی نسل کو روشناس کرانے میں ان کی تفسیر ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے - یہی وجہ ہے کہ سلف میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ کسی مفسر کی تفسیر کو اس کی زندگی میں اتنا قبول عام حاصل ہوا ہو -

اراکین انجمن خدام القرآن اور رفقائے تنظیم اسلامی - اس موقع پر مولانا کے پس ماندگان اور جماعت اسلامی سے وابستگان کے غم میں خود کو برابر کے شریک پاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے !

' ادارہ '

(مُرتّب)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

عرضِ احوال

ماہنامہ 'میثاق' کا زیرِ نظر شمارہ ایسے وقت میں شائع ہو رہا ہے جب کہ مُدیر مسئول 'میثاق' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بیرونِ ملک تبلیغی دَورے پر ہیں۔ ان کی غیر حاضری کی وجہ سے خیال ہوا کہ اس ماہ کی اشاعت ملتوی رکھی جائے، اور ڈاکٹر صاحب کی مراجعتِ وطن کے بعد اکتوبر و نومبر کا 'میثاق' اکٹھا شائع کیا جائے۔ لیکن بعض احباب کی رائے یہ تھی کہ اس طرح 'میثاق' کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو جائے گی۔ اور اس کے قارئین کو شدید زحمتِ انتظار اٹھانا پڑے گی۔ جب ترتیب و تدوین کے لئے مواد موجود ہے تو کیوں نہ اسے بروقت شائع کر دیا جائے۔ مشورہ معقول بھی تھا اور صائب بھی، اس لئے اس پر عمل کرتے ہوئے 'میثاق' کی یہ اشاعت پیشِ خدمت کی جا رہی ہے۔

اِس اشاعت میں ڈاکٹر صاحب کی دو تقاریر شامل کی جا رہی ہیں۔ جن میں سے پہلی تقریر 'اَمثالُ القرآن' کے عنوان سے پاکستان ٹیلیویژن سے TELE-CAST ہو چکی ہے۔ اِس میں ڈاکٹر صاحب نے تفہیمِ مدّعا کے لئے امثال کی افادیت اور قرآنِ حکیم اور دوسری کُتبِ سماویہ میں اُن کے استعمال کی حکمت و اہمیّت پر روشنی ڈالتے ہوئے بنی اسرائیل سے متعلق بعض تمثیلاتِ قرآن کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور بتایا ہے کہ کس طرح اہلِ عالم پر فضیلت رکھنے اور ان کی قیادت و امامت کے مقام پر فائز ہونے کے بعد یہ قوم کتابِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال دینے کی وجہ سے کلب و حمار کی صفوں میں شامل ہو گئی اور پھر اس حوالے سے انہوں نے اُمّتِ مُسلمہ کو متنبّہ کیا ہے، کہ کہیں وہ بھی اپنے مقصدِ تشکیل و بعثت کو بھول کر اور جس ہدایتِ ابدی و سرمدی - قرآنِ حکیم - کی وہ حامل ہے، اسے مہجور و متروک بنا کر اسی حشر سے دوچار نہ ہو ۔

اُن کی دوسری شاملِ اشاعت تقریر "منصبِ رسالت اور اُس کا مقصد" دس تقریروں کے اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے جو انہوں نے از ۷ر اپریل تا ۹ر جون ۱۹۷۸ء، ماڈل ٹاؤن کی مختلف مساجد میں سیرت کمیٹی کے زیرِ اہتمام کیں سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے موضوع پر تقریر و تحریر کا معمول مدّت سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ لیکن عام طور پر اُن میں آپؐ کے کارناموں کو کچھ اِس انداز سے پیش کیا جاتا ہے، جس سے سامع یہ تأثر لیتا ہے کہ (معاذ اللہ) آپؐ زیادہ سے زیادہ ایک مقامی مصلح تھے، جنھوں نے اپنے معاشرے کی اصلاح و تطہیر فرمادی۔ یا آپؐ کی صرف مافوق الطبیعاتی خصوصیات کو اس آب و تاب اور رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ عشّاق سر جھوم کر رہ جاتے ہیں، اپنے رحمتِ عالم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مثال کو سامنے رکھ کر پوری دُنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہونے کا داعیہ اُن کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر اِس نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی ہے اور اپنے سامعین کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ آپؐ کی بعثت پوری دُنیا کی ہدایت کے لئے تھی، آپؐ کی دعوت ہمہ گیر تھی اور قیامت تک کے لئے تھی۔ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے ایک عالمگیر انقلاب کے لئے مبعوث کیا تھا، اور عرب معاشرہ کا انقلاب تو اس سلسلے کا صرف پہلا قدم تھا۔ دوسرے قدم کے طور پر آپؐ نے مشرق و مغرب کے ائمہ کفر کے نام دعوت نامے ارسال کر کے اُن پر اتمامِ حجّت کر دیا تھا۔ خلفائے راشدین نے حضورؐ کے اِس مقصدِ حیات کی تکمیل کرتے ہوئے، اسے ایشیا، افریقہ اور یورپ کی سرحدوں تک پھیلایا اور اس طرح انہوں نے اِتّباع و عشقِ رسولؐ کا عملاً حق ادا کر دیا۔ تاہم ابھی بہت سا کام باقی ہے اور اس کی تکمیل وہ قرض ہے جو ہم وابستگانِ دامنِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذمّے واجب الادا ہے۔ اِس طرح ڈاکٹر صاحب کی یہ تقاریر حضورؐ کو ایک عالمگیر انقلاب لانے والے پیغمبر کی حیثیت سے سامنے لاتی ہیں اور آپؐ پر سلسلۂ نبوّت و رسالت ختم کر دینے کی حکمت اور تقاضوں کو واضح کرتی ہیں۔ اِن تقاریر سے

یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آتی ہے کہ آپؐ نے جو کچھ کیا، انسانی سطح پر کیا اور آپؐ کو مشکلات و مصائب کے اِن تمام مراحل سے گزرنا پڑا، جس سے ایک داعی کو گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اس پورے سلسلۂ تقاریر کا مطالعہ کیا جائے۔ ہم اِن شاءاللہ انہیں قسط وار 'میثاق' میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے، ویسے ان کے CASSETTES بھی تیار کرا لئے گئے ہیں۔ جو حضرات انہیں حاصل کرنا چاہیں وہ ناظمِ اعلیٰ مرکزی انجمن خدّام القرآنؒ لاہور سے رابطہ قائم کریں۔

سیرۃ النبی (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ہی کے سلسلہ میں مولانا وصی مظہر صاحب ندوی کی دو تقاریر بھی شاملِ اشاعت ہیں۔ یہ بھی ایک سلسلۂ تقاریر کی کڑیاں ہیں۔ مولانا نے قرآن مجید کے چشمہ ہائے شیریں کو منبع بنا کر سیرت کا بحرِ ذخّار بہا دیا ہے اور خوب بہایا ہے۔ اس طرح انہوں نے حضرت عائشہؓ کے اس جامع کلمہ کی تصدیق کر دی ہے کہ: "کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ!" اِن شاءاللہ ہم ان تمام تقاریر کو بھی بالاقساط قارئین کی نذر کرتے رہیں گے۔

سیّد خورشید احمد صاحب گیلانی نے اخلاقِ نبویؐ پر ایک مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔ اخلاق سے عام طور پر کسی شخص کی ذاتی عادات اور خصال مراد لی جاتی ہیں اور حقیقت یہی ہے کہ اخلاقِ نبویؐ پر کلام کرتے وقت ہم حضورؐ کو شخصی طور پر اخلاقی لحاظ سے ایک برتر انسان ہونے کا تأثر دیتے یا لیتے ہیں۔ گیلانی صاحب نے اس عامیانہ روش سے ہٹ کر خُلق کو اس کے ہمہ گیر مفہوم میں لیتے ہوئے گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ اخلاق کا لفظ اتنا وسیع المعنیٰ ہے کہ وہ شخصی سے لے کر اجتماعی صفات و خصال تک کا جامع ہے اور قرآن نے حضورؐ کے بارے میں: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ کی جو عظیم شہادت دی ہے، وہ صرف آپؐ کے ذاتی خصالِ حمیدہ کا اعلان نہیں ہے، بلکہ وہ آپؐ کی سیرت کے انفرادی و اجتماعی تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور پھر تنگ دامانیٔ اوراق کے پیشِ نظر آپؐ کے صرف چند اخلاقِ عالیہ کو لے کر انہوں نے بتایا ہے کہ کس طرح حضورؐ نے شخصی و اجتماعی معاملات میں حسنِ اخلاق کا ثبوت دیا ہے ❊

(بقیہ ص ۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امثال القرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری تقریر جو پاکستان ٹیلیویژن سے نشر ہوئی

قرآنِ حکیم کا ہر پڑھنے والا جانتا ہے کہ اس میں تمثیلات بکثرت وارد ہوئی ہیں، اور جن کی نگاہ سابقہ کتبِ سماویہ بالخصوص انجیل پر بھی ہے وہ جانتے ہیں کہ تمثیلات کے ذریعے ابلاغ و تفہیم تمام آسمانی کتابوں کا مشترک وصف ہے اور انجیل میں تو یہ وصف انتہا درجے کو پہنچا ہوا ہے۔

اِن تمثیلات کی حکمت کے ضمن میں قرآنِ حکیم نے متعدد مقامات پر وضاحت کی ہے کہ ان سے مقصود یہ ہے کہ لوگ غور و فکر سے کام لیں اور تعقّل و تفکّر کی روش اختیار کریں۔ مثلاً سورۂ حشر کی آیت ۲۱ میں ارشاد ہوتا ہے: وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ٥ —— : "(اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر کریں!)" —— اسی طرح سورۂ عنکبوت کی آیت ۴۳ میں ارشاد ہوتا ہے: —— وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ٥ —— "(اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں لیکن اُنہیں صرف اصحابِ علم ہی سمجھ پاتے ہیں!)" اسی طرح سورۂ ابراہیم کی آیت ۲۵ میں ارشاد ہوتا ہے: وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ٥ — "(اور اللہ لوگوں کے لئے تمثیلیں بیان کرتا ہے تاکہ انہیں یاددہانی حاصل ہوسکے!)" —— اس موضوع پر قرآن مجید کا اہم ترین مقام سورۂ نور کی آیت ۳۵ میں ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے: وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ٥ —— "(اور اللہ تمثیلیں بیان کرتا ہے لوگوں کے لئے، اور خود وہ تو ہر چیز کا علم رکھتا ہے!)" یعنی تمثیل کی ضرورت انسانوں کو ہے اللہ کو نہیں۔ اللہ کو تو ہر چیز کا کما حقہٗ اور کما ہی علم حاصل ہے اور وہ ہر چیز کی اصل کنہ سے پوری طرح باخبر

ہے۔ البتہ بعض مشکل اور لطیف حقائق کے ضمن میں جن کے کامل ادراک سے عقلِ انسانی عاجز رہ جاتی ہے۔ انسان کی ضرورت کے تحت تمثیلات بیان کی جاتی ہیں۔

انجیل میں ہے کہ ایک بار حضرت مسیح علیہ السّلام کے ایک شاگرد نے آنجناب سے استفسار کیا کہ "اُستاد"! آپ تمثیلوں میں کیوں کلام کرتے ہیں؟ جس پر حضرت مسیح علیہ السّلام نے جواباً ارشاد فرمایا: "تاکہ وہی سمجھیں جن کا سمجھنا مفید ہو"۔ یہ تمثیلوں کی حکمت کا دوسرا پہلو ہے۔ یعنی یہ کہ بعض اعلیٰ علمی مضامین جن کا فہم صرف اصحابِ دانش ہی کے لئے ممکن بھی ہو اور مفید بھی۔ تمثیلات کے پیرائے میں بیان کر دی جائیں تاکہ وہ تو اُن کے ذریعے پوری بات کو پالیں۔ لیکن عوام النّاس جو ان اعلیٰ علمی حقائق کا تحمّل نہ کر سکتے ہوں اور جن کے، اُن کے ذریعے بہک جانے کا امکان ہو وہ اُن پر سے سرسری طور پر گزر جائیں اور اس طرح فتنے میں پڑنے سے بچ جائیں۔

سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۶ میں ایک نہایت فصیح و بلیغ تمثیل بیان ہوئی ہے جس میں ایک صاحبِ علم و فضل انسان کے حرص و ہوا کے دام میں پھنس کر اخلاقی پستیوں میں مبتلا ہو جانے کو کُتّے سے تشبیہ دی گئی ہے جو ہر حال میں ہانپتا رہتا ہے اور اُس کی زبان نکلی ہی رہتی ہے اور وہ چلتا ہے تو ہر دم زمین کو سونگھتے ہوئے ہی چلتا ہے کہ شاید کہیں کوئی چیز کھانے کی مل جائے۔ اس تمثیل کے صحیح فہم اور اُس کی فصاحت و بلاغت کا کسی قدر اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آیات ۱۷۵ تا ۱۷۷ کا ترجمہ سامنے رکھا جائے جو یہ ہے:

"اور اے نبی! اِن لوگوں کو اُس شخص کا حال سُنائیے جس کو ہم نے اپنی آیات عطا فرمائیں۔ لیکن وہ اُن سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اُس کے پیچھے لگ گیا اور بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اُسے اُن آیات کے ذریعے رفعت و بلندی مرحمت فرماتے۔ لیکن وہ تو زمین ہی کی جانب جھکتا چلا گیا اور اُس نے اپنی خواہشات و شہوات کی پیروی اختیار کر لی تو اس کی مثال کُتّے کی سی ہے کہ اگر تم اس پر بوجھ ڈالو تب بھی زبان نکالے رکھتا ہے اور اگر چھوڑ دو تب بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔ یہ مثال ہے اُس قوم کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ پس (اے نبی!) انہیں سرگزشت سنائیے شاید کہ وہ غور کریں۔ بُری

ہے مثال اُن لوگوں کی جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور اس طرح خود اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا!"۔

یہ آیات سورۂ اعراف میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور بنی اسرائیل کے طویل تذکرے کے فوراً بعد وارد ہوئی ہیں اور ان کے ذریعے تو کسی مسلمان اُمّت کے زوال، اضمحلال اور فساد و بگاڑ کا نقشہ بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ کتابِ الٰہی کی حامل اور آیاتِ الٰہی کی امین ہونے کے باوصف، لذّتِ دُنیوی اور خواہشات و شہواتِ نفسانی سے مغلوب ہو کر بالکل کُتّے کی سی کیفیّت کی حامل ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ یہی مضمون سُورۂ جمعہ میں بھی وارد ہوا ہے۔ جہاں ایسی قوم کو جو حاملِ کتابِ الٰہی بنائی گئی ہو، لیکن اُس کی ذمّہ داریوں کو ادا نہ کرے، ایسے گدھے سے تشبیہ دی گئی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ "یعنی اُن لوگوں کی مثال جو حاملِ تورات بنائے گئے تھے، پھر انہوں نے اُسے نہ اُٹھایا، اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو!"۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۶ میں اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ایک شخص کی مثال بیان کی گئی ہے۔ اکثر مفسّرین کا اجماع ہے کہ اس کا نام بلعام بن باعورا تھا۔ یہ بنی اسرائیل کا ایک نہایت عالم و فاضل اور عابد و زاہد انسان تھا اور بنی اسرائیل میں اس کا بڑا اثر تھا۔ لیکن ایک عورت کے اغوا و اضلال کے نتیجے میں، گویا شہوت سے مغلوب ہو کر یہ پستیوں کی جانب چل نکلا اور اس کا سارا علم و فضل اور زہد و ورع ختم ہو کر رہ گیا۔ اس آیۂ مبارکہ میں: ولكنه اخلد الى الارض کے الفاظ بہت قابلِ توجّہ ہیں۔ اس لئے کہ انسان کا وجود مرکّب ہے دو وجودوں سے۔ ایک وجود حیوانی جو زمین کی مٹّی ہی سے بنا ہے اور اسی سے اس کی ساری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، اور اس کی جانب اس وجود کی پوری توجّہ مرتکز رہتی ہے ــــ اور دوسرا وجود روحانی جو علوی الاصل ہے۔ اس لئے کہ روح کی نسبت ذاتِ الٰہی سے ہے بفحوائے الفاظِ قرآنی: "وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ" (اور (اے نبی!) یہ آپ سے رُوح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجئے! کہ رُوح میرے ربّ کا امر ہے!)۔ اسی طرح دو مقامات پر فرمایا گیا: "فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ

فِیہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سَاجِدِیۡنَ ۝ ("اور جب میں اُسے پوری طرح بنا کر تیار کردوں اور اُس میں اپنی رُوح میں سے پھونک دُوں تو گر پڑنا اس کے آگے سجدے میں)

الغرض روحِ انسانی کی نسبت ہے ذات باری تعالیٰ کی جانب ـــــ

اس طرح اس کی تغذیہ و تقویت کا سامان بھی آسمانی ہی ہے یعنی کلامِ ربّانی۔ اور اگر کلامِ ربّانی کے ذریعے اس کو تقویت حاصل ہوجائے تو اس کی پرواز ہوتی ہے عالمِ ملکوت کی جانب جسے یہاں تعبیر کیا : " وَلَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰہُ بِھَا !" کے الفاظ سے مطلب یہ کہ ہم نے تو اسے اپنی آیات عطا فرمائی تھیں اور اُس کے لئے رفعتوں اور بلندیوں کا راستہ کھول دیا تھا۔ لیکن وہ بدنصیب اور بدبخت انسان زمینی خواہشات اور شہوات ہی کی جانب جھکتا چلا گیا ـــــ نتیجۃً شیطان کو اس پر پورا تسلّط حاصل ہوگیا اور اس نے اسے گمراہی کی آخری حدوں تک پہنچا کر دم لیا۔ اب اس کی کیفیت کتّے کی سی ہوگئی ہے، جس میں حرص کا مادّہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ وہ جب چلتا ہے تو خواہ اس کا پیٹ بھرا ہوا ہی کیوں نہ ہو لازماً زمین کو سونگھتے ہوئے ہی چلتا ہے کہ شاید کہیں سے کوئی چیز اور ایسی مل جائے جسے پیٹ میں ڈال لے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زبان ہر وقت نکلی ہی رہتی ہے اور اُس کی رال ہر وقت ٹپکتی ہی رہتی ہے۔ حتّٰی کہ اگر کوئی کنکر یا کوئی دوسری چیز اُسے ماری جائے تو اسے بھی ایک بار تو لپک کر پکڑ لیتا ہے، اور سونگھتا ہے کہ شاید یہ بھی کوئی کھانے ہی کی چیز ہو۔

آخر میں یہ ارشاد ہوا کہ یہ مثال ہے اُس قوم کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا واضح رہے کہ یہاں جھٹلانا سے مراد زبان سے جھٹلانا نہیں، عمل سے جھٹلانا ہے چنانچہ یہی الفاظ آئے ہیں سورۂ جمعہ کی متذکرہ بالا آیت کے آخر میں بھی کہ : " بِئۡسَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ !" (بُری ہے مثال اُن لوگوں کی جو اللہ کی آیات کو جھٹلائیں) اب ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل نے تورات کی زبان سے تکذیب کبھی نہیں کی۔ اُن کی تکذیب عملی تھی۔ یعنی اُن کا عمل ایسا تھا جس سے وجودِ تورات کی تکذیب ہوجاتی تھی افسوس کہ بعینہٖ یہی حال اس وقت اُمّتِ مسلمہ کا ہوچکا ہے کہ زبان سے تو قرآن مجید پر ایمان کا دعوی ہے لیکن عمل سے اُسے جھٹلایا جارہا ہے۔ زبانی دعویٰ تو یہ ہے کہ قرآنِ حکیم مکمّل ضابطۂ حیات ہے اور کامل ہدایت نامہ ہے۔ لیکن عمل سے ہم دُنیا

کے سامنے جو شہادت پیش کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآن میں زندگی کے عملی معاملے کیلئے کوئی رسائی موجود نہیں — اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ○ — اور اس طرزِ عمل کا اصلی سبب ظاہر ہے کہ وہی ہے جو اس آیت میں دی گئی تمثیل میں بیان ہوا — یعنی لذّاتِ دُنیوی کی طلب ——— اور خواہشات و شہواتِ نفسانی کا غلبہ ———

اللہ تعالیٰ ہمیں ان دونوں لعنتوں سے نجات عطا فرمائے اور قرآنِ حکیم کو عملی طور پر اپنا امام و رہنما بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ تاکہ ہم دوبارہ دینی و دنیوی دونوں طرح کی رفعتوں سے ہم کنار ہو سکیں۔ جیسے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے مطابق فرمایا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ : اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِہِ الْاٰخَرِیْنَ ○ — (اللہ تعالیٰ اس کتاب یعنی قرآنِ حکیم کی بدولت قوموں کو سربلندی عطا فرمائے گا، اور اس کو ترک کرنے کے باعث ذلیل و رسوا

بقیہ عرضِ احوال

محمد یونس جنجوعہ صاحب عرصۂ دراز سے 'میثاق' کے قلمی معاون چلے آتے ہیں۔ ہر سچے مسلمان کی طرح اتباعِ سنّتِ رسول ؐ سے اُن کو خصوصی شغف ہے وہ دین کو اس کے اصلی "مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ" رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بڑے دلی کرب کے ساتھ اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ دین میں بدعات کی ترویج دراصل اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کی تکذیب ہے کہ : اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط اس احداث و ابتداع سے نہ صرف دین کی سادگی اور اصلیت مجروح ہوتی ہے، اور اُس کا حلیہ بگڑ کر رہ جاتا ہے۔ بلکہ نئی رسوم و معمولات کی قیود اور پابندیاں دین پر عمل کو مشکل بھی بنا دیتی ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ط (اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں ڈالی) اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا کہ : یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ ط (اللہ تمہارے ساتھ آسانی اور سہولت کا معاملہ کرنا چاہتا ہے نہ کہ تکلیف اور تنگی کا!) — اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ —

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منصبِ رسالت اور اُسکا مقصد

(سیرت النبیؐ پر سلسلۂ تقاریر کی پہلی کڑی)

ڈاکٹر اسرار احمد

حضرات! سیرۃ النبیؐ اور اسلام پر دس تقریروں کے سلسلے کا جو آغاز آج ہو رہا ہے۔ اس کے اعلان کے ضمن میں آپ میں سے بعض حضرات نے یہ فقرہ پڑھا ہوگا کہ "کسی قوم کی تاریخ اس کے افراد کو خود شناسی کی دولت عطا کرتی ہے!" یعنی اگر کوئی قوم یا کوئی اُمّت اپنی تاریخ سے غافل اور ذہناً غیر متعلق ہو جائے تو یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص اپنے آپ سے غافل ہو جائے اور اپنے آپ کو بھول جائے بالفاظِ دگر خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا ہو جائے۔ تاریخ درحقیقت کسی قوم کی اجتماعی یادداشت ہوتی ہے، جس سے اس قوم کے افراد کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہماری روایات کیا ہیں۔ ہم اگر کوئی بامقصد گروہ یا جماعت تھے تو ہمارا وہ مقصد کیا تھا، اس کے اعتبار سے ہم اس وقت کہاں کھڑے ہیں۔ ہماری اجتماعی جدّ و جُہد کا رخ کیا ہونا چاہیئے، یہ تمام اُمور درحقیقت اپنی تاریخ کے صحیح فہم ہی سے اس قوم کو میسّر آسکتے ہیں اور اگر کوئی قوم اپنی تاریخ سے غافل ہو جائے یا اس کا کوئی مسخ شدہ تصوّر (DISTORTED VERSION) اس کے سامنے رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قوم اپنے اجتماعی نصب العین سے غافل ہے اور مجھے یہاں اس امر کی زیادہ وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ کوئی قوم اور کوئی مجموعہ افراد کسی اجتماعی نصب العین کے بغیر اپنا وجود باوقار اور باعزّت طور پر قرار نہیں رکھ سکتی، چاہے ویسے برائے نام زندہ رہنے کو وہ بیشک رہے اس طرح کہ نہ اس کا کوئی وقار ہو اور نہ کوئی عزّت، نہ دنیا میں اس کی

کوئی حیثیت ہو، نہ اقوامِ عالم میں اسے کسی معاملے میں کوئی اہمیت حاصل ہو۔ جیسے کہ اس وقت ہم جی رہے ہیں۔ باعزت و باوقار قوم وہی ہوگی کہ جس کے سامنے کوئی اجتماعی نصب العین ہو۔ اس سلسلۂ تقاریر کی اصل غرض و غایت یہی اجتماعی خود شناسی ہے۔ علامہ اقبالؔ مرحوم کا ایک مشہور مصرع ہے :۔ "اپنی خودی پہچان او غافل افغان!" یہی بات ایک مسلمان سے بھی کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے کہ میں کون ہوں، کس اُمّت سے میرا تعلّق ہے، میرا اجتماعی نصب العین کیا ہے، میرا ماضی کتنا شاندار تھا، میرے اسلاف کی روایات کتنی عظیم تھیں، میں کتنے عظیم ورثے کا وارث ہوں اور میرے سامنے جدّوجہد اور اجتماعی سعی کے لئے نقشہ کیا ہے۔ ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے ❊ وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

یہ تمام باتیں وہی ہیں کہ جو درسِ قرآن کے ضمن میں وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہی ہیں۔ اس لئے کہ درسِ قرآن کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم سمجھیں کہ بحیثیتِ امّتِ مسلمہ ہمارا مقام کیا ہے، ہمارے فرائض کیا ہیں اور یہی درحقیقت پیشِ نظر ہے۔ اس سلسلۂ تقاریر سے کہ یہ بات سیرت اور تاریخ کے حوالے سے مجھے مُبرہن اور مدلّل ہوکر سامنے آجائے، یعنی مقصد وہی ہے جو علامہ اقبال مرحوم نے بیان کیا ہے ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست ❊ سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

یہ شعر و سخن، یہ غزل گوئی مقصود نہیں ؎

من اے میرِ امم داد از تو خواہم ❊ مرا یاراں غزل خوانے شمردند

یعنی مجھ پر تو ظلم کیا ہے میرے ساتھیوں اور دوستوں نے کہ مجھے غزلخواں اور شاعر سمجھا ہے۔ کیسا پیارا انداز ہے علامہ اقبال کے احتجاج کا، کہتے ہیں : ع "شاعری زیں مثنوی مقصود نیست!" کہ شاعری تو میرا مقصد ہی نہیں ہے مقصد یہ ہے کہ ع :" سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را!" بڑی پیاری تشبیہ ہے۔ ایک قافلہ تھا، وہ قافلہ ایک منزل کی طرف گامزن تھا، اُس کی اونٹنیاں منتشر ہوگئیں، جس کا جدھر منہ اٹھا، چل پڑی، قافلہ درہم برہم ہوگیا

ع: "سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را!" مقصود اس سب سے یہ ہے کہ پھر وہ قافلہ وجود میں آئے۔

سمت میں اپنے سفر کا آغاز کر سکے۔ معلوم ہو کہ اس قافلے کی منزل کون سی ہے تاکہ قدم سے قدم ملا کر یہ امت اس کی طرف بڑھ سکے۔ ہماری تاریخ اگر اسے تاریخ اسلام کہا جا سکے، اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ نوعِ انسانی کی تاریخ۔ یہ مغالطہ کچھ لوگوں کے ذہن میں ہے کہ اسلام کا آغاز نبی اکرمؐ سے ہوا۔ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اسلام کی تاریخ شروع ہوتی ہے حضرت آدم علیہ السلام سے، اس لئے کہ از روئے قرآن پہلا انسان پہلا نبی بھی تھا۔ تو گویا کہ تاریخ نبوت تاریخ آدمیت ہے۔ اور اس کو آپ چاہیں تو تاریخ اسلام کہہ لیں۔ سب انبیاء کا ایک ہی دین تھا: شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ سورۂ شوریٰ کی اس آیت میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا کہ: اے مسلمانو! تمہارے لئے وہی دین ہم نے معین کیا ہے جس کی وصیت اور تاکید ہم نے ابراہیمؑ کو کی، موسیٰؑ کو کی، عیسیٰؑ کو کی علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام!

یہ ایک ہی دین ہے اور تمہارا فرض کیا ہے: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ، وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ اس دین کو قائم کرو، قائم رکھو، اور اس کے بارے میں آپس میں تفرقے میں مبتلا مت ہو جاؤ۔ تو دین ایک ہی ہے دینِ اسلام ــــ تاریخ اسلام کا آغاز یوں تو ہوا حضرت آدم علیہ السلام سے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تاریخ نبوت ہی تاریخ آدمیت ہے۔ البتہ امتِ مسلمہ کی تاریخ کا آغاز ہو گا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، یعنی امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جو تاریخ ہے اس کا ہم آغاز کریں گے آنحضورؐ کی سیرت سے اس کا سبب یہ بھی ہے کہ اس امت کا جو HISTORICAL ROLE ہے یہ الفاظ غیر ارادی طور پر میری زبان پر آئے۔ لیکن یہ ایک بڑی مشہور کتاب کا عنوان ہے، اور وہ ہے M. N. ROY کی کتاب۔ "THE HISTORICAL ROLE OF ISLAM"

اس امت کی تاریخ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے پس منظر میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک CONTEXT ہے، اس کا ایک پس منظر ہے۔ اگر اس کو صحیح طور پر نہ سمجھا جائے تو اس اُمت کی تاریخ کا صحیح فہم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ آپ اس کے مختلف ادوار کا تعین نہیں کر سکتے کہ اُن کا کیا مقام ہے کیا رتبہ ہے۔ مثلاً ایک مشہور قول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اکثر خطبات جمعہ میں نقل ہوتا ہے: خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ اس کا تعین ہوتا ہے دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے MISSION کے اعتبار سے، آپ کے مقصدِ بعثت کے اعتبار سے، اس لئے کہ اس خیر القرون یعنی دورِ نبویؐ کے بعد دورِ خلافتِ راشدہ ہے۔ دورِ خلافتِ راشدہ کا اصل مقام و مرتبہ کس اعتبار سے ہے، اس کی اصل فضیلت کی بنا کیا ہے، اُس کا ROLE کیا ہے، اس کا CONTRIBUTION کیا ہے۔ اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔ صرف اس وقت جب کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کو سمجھ لیا جائے۔ اس کے بعد مسلمانوں کی تاریخ کسی ایک قوم کی تاریخ نہیں ہے، اس میں بہت سی اقوام کی تاریخ شامل ہے۔ اگر لفظ قوم ہی استعمال کرنا ہے تو عربوں کی تاریخ اس کا جزو ہے۔ ترکانِ سلجوقی کی تاریخ اس کا ایک جزو ہے، ترکانِ عثمانی کی تاریخ اس کا ایک جزو ہے، بربروں کی تاریخ اس کا ایک جزو ہے، ترکانِ تیموری کی تاریخ اس کا ایک جزو ہے۔ بہت سی اقوام کی تاریخ مل کر مسلمانوں کی تاریخ بنتی ہے۔

لیکن جب آپ امتِ مسلمہ کی تاریخ کو سمجھنا چاہیں گے تو اس کو اسی حوالے سے سمجھا جا سکے گا کہ اس اُمت کی غرضِ تأسیس کیا تھی، اس کو برپا کس لئے کیا گیا۔ اس کا اجتماعی نصب العین کیا تھا اور اس حوالے سے اس کی تاریخ کے ادوار کون کون سے ہیں۔ قومیں آئیں، قومیں گئیں۔ عرب اُبھرے، عرب گرے۔ ترک اُبھرے ترک گرے۔ قوموں کا عروج و زوال اپنی جگہ پر۔ سوال یہ ہے کہ اس MISSION کا کیا معاملہ ہوا جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے حوالے کر گئے تھے، اور پھر اس کے حوالے سے معین کیا جائے کہ آج ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ہمارے مسائل گوناگوں ہیں، متنوع ہیں، طرح طرح کے ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ وہ ہے

جیسے کہ حدیث میں الفاظ آئے ہیں : من جعل ھمومہ ھمّا واحدًا ھمّ الاٰخرۃ کفاہ اللہ ھمّ دُنیاہُ جو شخص اپنے تمام تفکّرات کو ایک فکر میں گم کر دے' یعنی آخرت کا فکر اللہ تعالیٰ اس کے تمام تفکّرات کو دور فرما دے گا۔ اس کی ساری ضروریات کی کفالت وہ خود فرمائے گا۔ اسی طرح اُمّت کے مسائل بہت ہیں لیکن اُن میں جو اصل مسئلہ ہے، پہلے اس کا شعور ہو، اس کا تعین ہو، اس کو سمجھا جائے اور یہ بات سامنے آجائے کہ بقیہ سارے مسائل اسی ایک مسئلے میں گم ہو سکتے ہیں۔ بلکہ یہ سب مسائل پیدا ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ اس ایک مسئلے سے اغماض برتا گیا ہے، اس کو ترک کیا گیا ہے۔ اگر یہ بات سامنے آئے تو یہ ہے درحقیقت تاریخ کے مطالعہ کا کوئی فائدہ اور میں اپنی تقریروں میں کوشش کروں گا کہ انہی مسائل پر اس خاص پس منظر میں آپ کے سامنے اپنے کچھ خیالات بیان کروں جیسا کہ میں نے عرض کیا ہمارے نزدیک تو پوری تاریخ انسانی بھی تاریخ نبوّت ہے اور پھر مسلمانوں کی تاریخ کی اساس و بنیاد تو سیرتِ محمّدیہ علیٰ صاحبھا الصّلوٰۃ والسّلام ہے۔ تو سب سے پہلے ہم یہ سمجھیں گے کہ از روئے قرآن بعثتِ انبیاء کا مقصد کیا ہے، سلسلۂ رسالت کی غرض و غایت کیا ہے۔ اس کے بعد کل اِنْ شاء اللہ اس پر گفتگو ہوگی کہ نبوّت و رسالت کا جو اتمام و اکمال ہوا ہے حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم پر جس کے نتیجے میں ختمِ نبوّت واقع ہوئی۔ اس کے کیا لوازم ہیں، اس کے کیا نتائج ہیں اس کی کیا IMP-LICATIONS ہیں اور پرسوں سے اِنْ شاء اللہ پھر سیرت النّبیؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا بھی واقعاتی انداز میں بیان ہوگا۔ پھر خلافتِ راشدہ کا اس کے پس منظر میں اور پھر تاریخِ اُمّتِ محمّد علیٰ صاحبھا الصّلوٰۃ والسّلام کا۔

آج کے موضوع میں پہلے یہ بات سمجھ لیجئے کہ نبوّت اور رسالت دو الفاظ بھی ہیں، دو اصطلاحات بھی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ایک جداگانہ مفہوم بھی ہے۔ لیکن میری آج کی گفتگو کے اعتبار سے دونوں الفاظ، مترادف یا ہم معنی الفاظ کی حیثیت سے سامنے آئیں گے۔ میں نے یہ بات پہلے بھی ظاہر کی ہے، یہ ہمارے ہاں ایک بڑا علمی مسئلہ رہا ہے کہ آیا نبوّت و رسالت بالکل ہم معنی الفاظ

ہیں یا ان کا کوئی دوسرا مفہوم بھی ہے۔ اگر ان میں کوئی فرق اور امتیاز ہے تو کس بنیاد پر۔ اس میں میری بھی ایک رائے ہے جو مختلف اوقات پر میں ظاہر کرتا رہا ہوں۔ اجمالاً یہ کہ نبوّت ایک ذاتی حیثیّت اور ایک ذاتی مرتبہ ہے جبکہ رسالت ایک فرضِ منصبی ہے، اس کو منصب سے تعبیر کیجئے اور نبوّت کو مرتبے سے۔ اس کی وضاحت ایک سادہ سی مثال سے ہوگی۔ ہمارے ہاں ایک C.S.P. ایک کاڈر (CADRE) ہے، ایک سطح ہے، ایک مرتبہ ہے جو اس کو QUALIFY کر لیتا ہے، وہ اس خاص جگہ پہ آجاتا ہے۔ اب اسے APPOINT کیا جائے گا۔ کہیں وہ ڈی۔سی ساہیوال ہو سکتا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ کہیں وہ سیکرٹری لگ جائے۔ CADRE اس کا معیّن ہے کہ وہ C.S.P. ہے نبوّت وہ مرتبہ ہے اور رسالت وہ تعیّن ہے کسی قوم کی طرف جب معیّن طور پر بھیجا گیا۔ ذاتی حیثیّت میں وہ نبی ہے اور اس منصب کے لحاظ سے وہ رسول ہے۔ یہ بات تو ہمارے ہاں مجمع علیہ ہے کہ ہر رسول تو لازماً نبی بھی ہوتا ہے، ہر نبی رسول نہیں ہوگا۔ اب یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ ذاتی حیثیّت میں وہ نبی ہے۔ لیکن جب اس کا تعیّن ہو گیا مثلاً اذھب الیٰ فرعون۔ اب وہ رسول ہے۔ چنانچہ کہا: رسولاً الیٰ بنی اسرائیل۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا تعیّن ہوتا ہے، اُدھر جاؤ اس قوم کی طرف، اُس شہر کی طرف: اِلیٰ مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا۔ عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام۔ تو یہ جو رسالت ہے، اس میں 'اِلیٰ' ضرور ہوگا (کسی کی طرف) لیکن اپنی ذاتی حیثیّت میں وہ نبی ہے دیکھئے! اس آیت میں ان دونوں الفاظ کو کیسے سمو دیا گیا۔ حضورؐ کے بارے میں ارشاد ہے: یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ــــــ اے نبی! ہم نے بھیجا ہے آپ کو ذاتی حیثیت میں نبی اور بھیجے جانے کی حیثیّت میں رسول۔ یہاں یہ فرق ذہن میں رکھئے کہ بقیہ تمام انبیاء کسی معیّن قوم کی طرف بھیجے گئے اور حضورؐ کے بارے میں قرآن نے اسی لئے صراحت کی: وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا۔ بہرحال میں آج نبوّت کے موضوع پہ گفتگو نہیں کروں گا۔ یہ اپنی جگہ پہ ایک بڑا مستقل اور

بڑا طویل مضمون ہے۔ مراتبِ چہارگانہ یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین۔ اِن میں سب سے اُونچا مرتبہ نبوّت کا ہے۔ میری آج کی گفتگو حقیقت منصبِ رسالت سے متعلق ہے، اِس کی غرض و غایت کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے پہلے ایمان باللہ، ایمان بالرّسالت، ایمان بالآخرت کے مابین منطقی ربط و تعلق کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایمان بالرّسالت اِس کُل کا ایک جزو ہے اور تینوں اجزاء باہم مربوط ہیں، ان کا بڑا گہرا ربط ہے۔ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا نتیجہ جو نکلتا ہے۔ اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ حیاتِ انسانی کے بارے میں ان دونوں کو جمع کرنے سے ایک بات متعیّن ہوتی ہے۔ اسے نظریۂ حیات کہہ لیں، نظریۂ زندگی کہہ لیں۔

یہ انسانی زندگی صرف پچاس ساٹھ سال نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی ایک بڑا طویل سفر ہے ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ ❊ جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اصل زندگی تو موت کے بعد کی ہے۔ یہ ہے اصل میں انقلابی نتیجہ جو مترتّب ہوتا ہے ایمان پر۔ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یعنی اصل زندگی تو آخرت کی ہے، کاش! کہ انہیں معلوم ہوتا) اس سے زمین و آسمان کا فرق واقع ہوتا ہے۔ ایک شخص کے نزدیک اصل زندگی یہ ہے یہاں پیدائش سے لے کر موت تک اور ایک کے نزدیک یہ تو کتابِ زندگی کا دیباچہ ہے، مقدّمہ ہے، تمہید ہے۔ اصل زندگی موت کے بعد ہے۔ اب جو اصل زندگی ہے: وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۔ اس کا کل دار و مدار اسی نظریے پر ہے انسان وہاں عافیت میں رہے گا یا تکلیف میں رہے گا، روح و ریحان و جنّتِ نعیم اس کا نصیب بنیں گے یا تصلیۂ جحیم اس کا انجام بنے گا۔ ابدالآباد تک کی راحت یا ہمیشہ ہمیش کے لئے عذاب، اِس کا فیصلہ ہوگا الیوم الآخر کو آپ کے ایمانیات میں PIVOTAL سب سے بڑا مرکز ایمان بالآخرہ ہے:

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔ اِس یومِ آخر

کا محاسبہ ہی فیصلہ کن ہے۔ جو اس روز کامیاب ہوا، وہ کامیاب اور جو اُس روز ناکام ہوا وہ ناکام۔ تباہ و برباد۔ سُورۂ تغابن میں فرمایا: ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ (وہ ہار اور جیت کے فیصلے کا دن ہے!) اب آپ سوچئے ایمان اگر واقعتہً کسی قلب و ذہن میں شعوری سطح پر کچھ بھی جگہ بنالے تو انسان کی سوچ کس قدر بدل جائے۔ VALUES بدل جائیں گے، نقطۂ نظر بدل جائے گا۔ اصل فیصلہ کن چیز یہی ایمان بالآخرہ ہے۔ اس محاسبۂ اُخروی کی بنیاد کیا ہے، یہاں سے بات سمجھئے تو فلسفۂ رسالت سمجھ میں آئے گا۔ یہ فیصلہ کہ کون جیتا کون ہارا، کون کامیاب رہا اور کون ناکام، تو اُسی دن ہوگا۔ لیکن اس دن کے محاسبے کی بنیاد کیا ہے۔ امتحان لیا جاتا کچھ پڑھا کر، حساب لیا جاتا ہے کچھ دے کر۔ یہ جو محاسبہ ہے جس کی رُو سے یہ زندگی ایک امتحانی وقفہ بن گئی ہے

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب ❖ اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

امتحان کی بنیاد کیا ہے، محاسبۂ اُخروی کی اساس کیا ہے۔ سب سے پہلی چیز تو یہ سمجھئے، قرآن مجید ان موضوعات پر روشنی ڈالتا ہے، یہ بنیادی باتیں ہیں: اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ (ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا، تاکہ اسے پرکھیں، جانچیں، آزمائیں۔ پس ہم نے اُسے سمیع اور بصیر بنایا ہے!) یہاں یہ کلمہ فاء بہت اہم ہے — پس جب امتحان لینا ہے تو کچھ صلاحیتیں دی ہیں، ذمہ داری ڈالی ہے، تو کچھ استعداد بھی پیدا کی ہے، مسئول بنایا ہے تو کچھ دے کر بنایا ہے ہم نے اسے سمیع اور بصیر بنایا ہے، سماعت اور بصارت دے کر بھیجا ہے، عقل اور شعور کی قوتیں دے کر بھیجا ہے۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر خیر و شر کی معرفت اور تمیز دے کر بھیجا ہے۔ انسان اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اُسے بتائے کہ یہ نیکی ہے اور یہ بدی ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (قسم ہے نفسِ انسانی کی اور جو اسے تیار کیا، اس کی نوک پلک سنواری اور اسے فجور اور تقویٰ کا علم الہامی طور پر دیا!) وہ جانتا ہے کہ بدی کیا ہے اور نیکی کیا، شر کیا ہے اور خیر کیا۔ انسان اندھا بہرہ نہیں ہے کہ بغیر کوئی امداد دیئے اسے

جھونک دیا گیا ہو۔ یہ ظلم ہوتا بلکہ ہم نے کچھ دے کر اسے بھیجا۔ انسان کے اندر کچھ داعیاتِ شرّ بھی ہیں: اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ۔ لیکن اس کے اندر وہ روحِ ملکوتی بھی ہے جو اسے بلندی کی طرف، نیکی کی طرف، خیر کی طرف، عالمِ ملکوت کی طرف کھینچتی ہے۔ جہاں وہ نفسِ امّارہ ہے جو پستی کی طرف، عالمِ سفلی کی طرف، برائی کی طرف کھینچنے والا ہے۔ وہیں وہ روحِ ملکوتی بھی ہے جو اسے عالمِ علوی اور عالمِ ملکوت کی طرف پرواز کرنے کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ اسی طرح خارج میں یہ بات تو بہت معلوم اور معروف ہے۔ کون مسلمان ہے جو نہیں جانتا ہوگا کہ کچھ غیر مرئی قوّتیں بھی ہیں جو انسان کو شرّ کی طرف بلانے والی ہیں۔ جنّات ہیں اُن کا گرو ابلیسِ لعین ہے، شرّ کی طرف بلانے والا، بُرائی کو مُزیّن کرنے والا بے حیائی کی رغبت دلانے والا، نفرتیں اور کدورتیں پیدا کرنے والا:

اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ـــــ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ـــــ اِنَّهٗ یَرٰکُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ

وہ تم پر حملہ کرتے ہیں اور تمھارے لئے گھات میں بیٹھتے ہیں، وہ بھی اور اس کا قبیلہ اُس کی ذرّیتِ معنوی بھی اور صلبی بھی۔ جہاں سے کہ تم انہیں دیکھتے نہیں۔ اسی طرح غیر مرئی قوّتیں خیر کی بھی موجود ہیں۔ یہ حقیقت اس دور میں کچھ RATIONAL-ISM اور کچھ SCIENTIFIC ATTITUDE کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے لیکن ہے بہت بڑی حقیقت۔ ملائکہ ہیں جو خیر کی طرف بلا رہے ہیں، نیکوں کی پیٹھ ٹھونکنے والے، شاباش دینے والے، ان کی تشویقِ قلبی کا ذریعہ بنتے ہیں: اَنْ ثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اہلِ ایمان کے پاؤں جمادو) پاؤں جمتے ہیں جب دل جما ہوا ہو: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ یوں سمجھئے ایک جنگ ہے خیر و شرّ کے درمیان، انسان کے اندر بھی اور خارج میں بھی۔ اندر خیر کی طاقت بھی ہے اور شرّ کی بھی، باہر بھی داعیانِ خیر بھی ہیں اور داعیانِ شرّ بھی۔ گویا کہ ایک بڑی ہی متوازن قسم کی قوّتیں

ہیں جو ایک دوسرے کو BALANCE کر رہی ہیں - ان حالات میں جب کہ شرّ کی طاقت ہے تو خیر کی طاقت بھی ہے - انسان کو سماعت اور بصارت بھی دی گئی ہے، عقل و شعور کی قوتیں بھی عطا کی گئی ہیں - نیکی اور بدی کی تمیز بھی عطا کی گئی ہے - ہر انسان اپنی جگہ پر مسئول ہے، ذمہ دار ہے، جواب دہ ہے خواہ کوئی نبی آئے یا نہ آئے، کوئی وحی نازل ہو یا نہ ہو، کسی رسول کو بھیجا جاتا یا نہ بھیجا جاتا - انسان مسئول ہے ان استعدادات کی بنیاد پر جو اس کے اندر قدرت نے ودیعت کی ہیں - یہاں وہ اشکال حل ہو جاتا ہے جو بعض حضرات کو پیش آتا ہے کہ جن لوگوں تک نبی کی دعوت نہیں پہنچی ان کا محاسبہ کیسے ہوگا - تو یہ بات جان لیجئے کہ ہر انسان اپنی جگہ مسئول ہے اللہ تعالیٰ کی حجّت اس پر قائم ہے : جَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا + وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا - اس کی بنیاد پر وہ ذمہ دار ہے، مسئول ہے - مَیں نے پہلے بھی ٹاؤن ہال کی تقریر میں یہی بات عرض کی تھی کہ عدل کا تقاضا یہی تھا - اس کے بعد ان پر کوئی اور ہدایت، کوئی نبوّت، کوئی رسالت، کوئی وحی عدل کا تقاضا نہیں — عدل کا تقاضا تو یہ ہے کہ داعیاتِ خیر و شرّ تمہارے اندر بھی رکھ دیئے اب تم ذمہ دار ہو، جدھر جاؤ ہو اس کا بدلہ تمہیں مل کر رہے گا، سزا ہو یا جزا ہو - البتہ رحمتِ خداوندی متقاضی تھی کہ مزید رہنمائی کے لئے رسالت و نبوّت کا سلسلہ جاری کیا جاتا - یہاں سے اس کو سمجھئے : وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ نبوّت و رسالت درحقیقت رحمتِ خداوندی کا مظہر ہے، عدلِ خداوندی کا نہیں - عدلِ خداوندی تو اس اعتبار سے بھی مکمل ہے کہ تمہیں امتحان میں ڈالا ہے تو نہتا نہیں ڈالا ہے، غیر مسلح نہیں ڈالا ہے، بغیر کچھ دیئے اس آزمائش میں مبتلا نہیں کیا ہے - بلکہ ہم نے یہ سب کچھ تمہیں دے کر بھیجا ہے - انبیائے کرام اور رسول (یہاں پر میں لفظِ نبوّت و رسالت مترادفات کے طور پر بول رہا ہوں!) کی بعثت، درحقیقت اتمامِ حجّت کے لئے ہوتی ہے، تاکہ انسان کے پاس کوئی حجّت، کوئی بہانہ، کوئی دلیل باقی

نہ رہے اپنی غلط روی کے لئے - اس کو آپ چاہیں تو قطع حجت کہہ لیں، چاہیں تو اتمامِ حجت کہہ لیں - میں نے آج سورۂ نساء کی جو آیت پڑھی ہے، یہ بڑی اہم آیات میں سے ہے - اس مقام پر انبیاء اور رسل کا نام بنام ذکر کیا گیا اور اس کے بعد فرمایا : رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ط (رسولوں کو ہم نے بھیجا مُبشّر اور مُنذر بنا کر ......) اور یہ دونوں الفاظ قرآن مجید میں بکثرت آئے ہیں، رسولوں کے بارے میں : وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا - سورۂ بنی اسرائیل میں حضورؐ سے خطاب کر کے فرمایا - سورۂ کہف میں اس کو جمع کے صیغے میں لائے : وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ج (اور نہیں بھیجتے ہم رسولوں کو مگر مبشّر اور نذیر بنا کر) لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (تاکہ نہ رہ جائے لوگوں کے لئے، لوگوں کے حق میں کوئی دلیل، کوئی بہانہ، کوئی عذر) عربی زبان میں 'ل' اور 'علی' کا استعمال ہوتا ہے ایک دوسرے کی ضد کے طور پر - ایک حجت، ایک دلیل کسی کے حق میں ہے، کسی کے خلاف ہے - ایک شہادت، ایک گواہی کسی کے حق میں ہو، کسی کے خلاف ہو - کوئی گواہی کسی مقدمے کے فریقین میں سے کسی کے حق میں جائے گی تو کسی کے خلاف جائے گی جس کے حق میں ہو گی اس کے لئے 'ل' کا حرف آئے گا : كُوْنُوْا شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (گواہ بن جاؤ اللہ کے لئے، اللہ کے حق میں) اور یہاں لفظ دونوں آ گئے - ایک حدیث میں بھی دونوں آتے ہیں : القرآن حجة لك او عليك (قرآن یا تو حجت ہے تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف) اس کو اپنا رہنما بناؤ امام بناؤ - یہ تمہارے حق میں دلیل ہو گا - اس کے ہونے کے باوجود، اس کو پڑھنے کے باوجود، اس کو سمجھنے کے باوجود غلط راستے پر چلے تو یہ تمہارے خلاف دلیل ہو گا : لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ (تاکہ نہ رہ جائے لوگوں کے حق میں، لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل) اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل ؟ کہ اے اللہ ! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تو چاہتا کیا ہے - اے اللہ ! ہم تو

نہیں جانتے تھے کہ یہ چیز تو نے حرام کی ہے۔ اس عذر کو ختم کرنے کے لئے ردِّ عذر اور اتمامِ حجّت کے لئے ہم نے رسولوں کو مُبشّر اور نذیر بنا کر بھیجا۔ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (اور اللہ تعالیٰ عزیز بھی ہے، زبردست بھی ہے اور حکیم بھی ہے۔ عزیز ہے زبردست ہے، مختارِ مطلق ہے، جیسے چاہے محاسبہ کرے، جیسے چاہے پرسش کرے کوئی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا لیکن حکیم بھی ہے۔ اس نے اپنے محاسبے کیلئے یہ بنیادیں معیّن کر دیں جو اس کی حکمت پر مبنی ہیں۔ ان الفاظ کو بھی نوٹ کر لیجئے کہ مبشّر اور نذیر بن کر آئے ہیں" فلسفۂ نبوّت و رسالت کے ساتھ اس کا بڑا گہرا ربط ہے۔ قرآن کے نزدیک HUMAN WILL (انسانی ارادہ) آزاد ہے۔ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُورًا۔ چاہے تو انسان شکر گذاری کی راہ اختیار کرے، فرمانبرداری کی روش اپنائے، چاہے تو کفرانِ نعمت کا رویہ اختیار کرے، سرکشی اور بغاوت کی راہ پر چلے، دونوں راستے کھلے ہوئے ہیں لہٰذا انسان کا فیصلہ ہے اصل۔ کوئی چیز بھی ثانوی درجے میں خیر یا شر کے لئے مؤید ہو سکتی ہے، تائیدی ہو سکتی ہے۔ انسان کے لئے کسی پہلو سے بھی نہ کسی داعئ شر کو کوئی اختیار حاصل ہے اور نہ کسی داعئ خیر کو کوئی اختیار حاصل ہے۔ قرآن مجید میں شیطانِ لعین کے بارے میں بار بار آیا ہے: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِيْنَ (میرے بندوں پر تجھے کوئی اختیار نہیں سوائے اس کے جو تیرا اتّباع اختیار کرے اور جو غاوین میں سے ہو، ان کی سوچ ان کی طلب خود کج ہو چکی ہو اور وہ تیرا اتّباع کریں، انہیں تو تو جہاں چاہے لے جا، جس کھائی میں چاہے لے جا کر گرا۔ لیکن میرے بندوں پر جو میرے راستے پر چلنا چاہیں تجھے کوئی اختیار نہیں) ۔

یوں سمجھئے کہ جو خارج کے داعیانِ شر ہیں، اُن میں سب سے بڑا ابلیس لعین ہے۔ اور خارج کے داعیانِ خیر جو ہیں اُن میں جو شخصیت اتمامِ حجّت کے درجے میں رسالت و نبوّت کے منصب پر اپنے معیارِ کمال کو پہنچی وہ محمّد رسول اللہ کی شخصیت مبارک ہے۔ اُن کو بھی صاف صاف بتا دیا گیا کہ: اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ

مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (اے نبیؐ! آپ کو اختیار نہیں ہے کہ آپ جسے چاہیں ہدایت دے دیں، یہ تو اللہ ہی ہے جو ہدایت دے سکتا ہے جس کو چاہے!) اس نے بھی اپنی ہدایت کا ایک ضابطہ بنایا ہوا ہے کہ جو ہدایت کا طالب ہوتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے: وَالَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ زبردستی وہ کسی کو ہدایت نہیں دیتا۔

اب رہا ایمان باللہ، ایمان بالرّسالت اور ایمان بالآخرہ کا باہمی ربط و تعلّق۔ تو رسالت اصل میں اتمامِ حجّت اور قطعِ عذر کے لئے ہے۔ انسان بذاتہٖ (AS SUCH) مسئول ہے، جواب دہ ہے، ذمّہ دار ہے ان استعدادات کی بنیاد پر جو اسے ودیعت کی گئی ہیں۔ جن سے مسلّح کر کے اسے اس امتحان میں ڈالا گیا۔ لیکن اس پر رحمتِ خداوندی کا تقاضا ہوا کہ اس پر اور اتمامِ حجّت کر دیا جائے، حق کو واضح کر دیا جائے۔ انبیاء آئیں، فطرت کے براہین و دلائل سے اور کلامِ الٰہی کے نور سے لوگوں کو اندھیروں سے نور کی طرف، روشنی کی طرف نکالیں، اُجالے میں لائیں، حق کی راہ روشن کریں، اُجاگر کریں۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس کا ایک عملی نمونہ پیش کریں۔ اب یہ سمجھ لیجئے، ایک حجّت علمی بھی ہوتی ہے۔ آپ نے ایک بات کو دلائل سے ثابت کر دیا، حجّت قائم ہو گئی۔ لیکن یہ حجّت قائم ہوئی ان لوگوں پر جن کی علمی سطح بلند ہے، جو اس دلیل کی VALUE پر، اس کی بنیاد پر سمجھ پائیں۔ اس کے بعد ایک اور بڑی وسیع نوعِ انسانی کی تعداد وہ ہوگی کہ جو شاید اس علمی سطح پر بات کو نہ سمجھ سکیں۔ لیکن اس کا کوئی عملی نتیجہ پیش کر دیا جائے تو وہ سمجھ سکیں گے۔ بات سامنے آجائے گی، کھل جائے گی۔ اسی لئے انبیائے کرام حق کی دعوت دیتے تھے قولاً، اور اُس کا نمونہ پیش کرتے تھے عمل سے، اور یہ نمونہ ہوتا تھا انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی اور اس سب کا جو حاصل ہے وہ قرآن مجید کی اصطلاح میں ہے شہادت۔ اس لفظ کو آپ ذرا اچھی طرح سمجھئے۔ یکم محرّم الحرام کی آج دوسری شب شروع ہو گئی اور یہ لفظ شہادت ہمارے ہاں بکثرت بولا جائے گا، لکھنے میں آئے گا، تقریروں کا

عنوان بنے گا - قرآن مجید کی رُو سے شہادت کا لفظ مستعمل ہوا ہے انبیاءِ کرام کے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لئے - یہ لفظ مقتول فی سبیل اللہ کے معنی میں پورے قرآن میں نہیں آیا - عجیب بات ہے اس کی نفی میں نہیں کرتا - حدیث میں آیا اور اس معنی میں آیا جو میں ابھی واضح کروں گا - لیکن اس بات پہ پہلے غور کیجئے کہ پورے قرآن مجید میں لفظِ شہادت یا شہید اس معنی میں نہیں آیا - صرف ایک آیت ہے سورۂ آلِ عمران کی جہاں یہ معنی لینے کی گنجائش موجود ہے : وَاتَّخَذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ - بس یہاں امکان ہے، لازم نہیں - چنانچہ قرآن مجید میں اللہ کی راہ میں قتل ہونے کا مضمون آیا ہے، بار بار آیا ہے، لیکن وہاں لفظ شہادت یا شہید نہیں ہے : وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ یہ سورۂ بقرہ میں ہے، سورۂ آلِ عمران میں پھر دُہرایا : وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ حضورؐ کے بارے میں فرمایا : وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ یہاں بھی اسی قتل فی سبیل اللہ کا ذکر ہے - صحابہ کرامؓ کے بارے میں فرمایا : يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ (وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں، پھر قتل کرتے بھی ہیں اور ہوتے بھی ہیں) لفظ شہید یا شہادت نہیں ہے، حضورؐ کی ایک دُعا آتی ہے، دعا ایک خواہش کا اظہار ہوتا ہے : لَوَدِدْتُّ اَنْ اُقْتَلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلُ (میری بڑی ہی تمنا ہے، میری بڑی ہی خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر مجھے زندہ کر دیا جائے، پھر اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤں!) تین مرتبہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے کی آرزو کا اظہار کیا ہے، مگر لفظ شہید کہیں نہیں آیا لفظِ شہید جو قرآن میں آتا ہے، وہ اس مضمون کی وضاحت کے لئے آیا ہے جو ابھی میں نے بیان کیا ہے - یعنی اتمامِ حجت خلقِ خدا پہ کر دینا - یہ ہے اصل شہادت

گواہی دے دینا، اللہ کی طرف سے، حق کی گواہی، صداقت کی گواہی توحید کی گواہی، رسالت کی گواہی، بعث بعد الموت کی گواہی، جزاء وسزا کی گواہی، جنت و دوزخ کی حقانیت کی گواہی - یہ وہ گواہی ہے جس کا دینے والا درحقیقت اللہ کا گواہ ہے اور یہ وہ گواہی ہے جس کیلئے اللہ کے رسول مبعوث ہوئے - مَیں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ط یہ شہادت قول سے ہوئی اور اگر اس کی شہادت آپ نے اپنی زندگی میں دے دی تو یہ بڑا مشکل کام ہے بقول اقبال مرحوم ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم ٭ کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا آسان اور اس کی گواہی عملاً دینا بہت مشکل ہے - حضرت بلالؓ کا اور جرم کیا تھا - یہی گواہی کہ اَحد اَحد اَحد ورنہ نہ تو چوری کی تھی نہ ڈاکہ ڈالا تھا، اس کی پاداش میں اوندھے منہ سنگلاخ زمین پہ جب کہ سورج نصف النہار پہ چمک رہا ہوتا تھا، انہیں گھسیٹا جاتا تھا مگر وہ پھر بھی آپکارتے چلے جاتے تھے کہ احد، احد، احد اب اس لفظ شاہد کو نوٹ کیجئے - جب نبی اپنی دعوت سے، اپنے قول سے، اپنے عمل سے، اللہ کی توحید و وحدانیت کی گواہی، آخرت کی گواہی، حق و صداقت کی گواہی عدل و انصاف کی گواہی دے دیتا ہے - تو گویا کہ اس نے حجت قائم کر دی نسل انسانی پہ اور اس کے لئے ہے اب لفظِ شہادت! : اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ط (ہم نے بھیج دیا ہے تمہاری طرف اپنا رسول تم پر گواہ بنا کر، جیسے کہ ہم نے بھیجا تھا ایک رسول فرعون کی طرف یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام!) یہی لفظ شاہد: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ط میں بھی آیا ہے! (یعنی اے نبی! ہم نے بھیجا ہے آپ کو شاہد بنا کر، مبشر بنا کر، نذیر بنا کر اور اللہ کی طرف بلانے والا بنا کر اُس کے حکم سے اور ہدایت کا ایک روشن چراغ بنا کر!) ان تمام حیثیتوں میں مقدم اور اہم ترین لفظ شہادت

ہے۔ یہ ہے شہادت درحقیقت اتمامِ حجت کے لئے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں رسولوں کی بعثت اس کے لئے ہے۔ اس کا ظہور ہوگا قیامت میں جب اُمتوں کی جواب دہی ہوگی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک محاسبہ عدالتِ اُخروی میں اجتماعی سطح پر ہوگا۔ اُمتوں کے معاملات طے ہوں گے۔ اس کو آپ ـــــ COLLECTIVE ACCOUNTABILITY ـــــ کہہ لیجئے اور اس کے بعد مرحلہ آئے گا: وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ط ہر ہر شخص کو جواب دہی کرنی ہوگی۔ جب محاسبہ امتوں کی سطح پر ہوگا، یہ بھی سُورۂ نساء کی ایک آیت ہے: فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ط (اے نبی! کیسا ہوگا اُس دن، کیا ہوگا اس دن کیا بنے گی اُس دن کہ جب کہ ہم ہر قوم پر، ہر اُمت پہ گواہ کھڑا کریں گے اور آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان کے خلاف) میں نے اسی لئے پہلے یہ وضاحت کی تھی کہ علیٰ آتا ہے مخالفت کے لئے، خلاف کے لئے: اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ۔ تم پر گواہ کس معنی میں؟ کہ تم پر اتمامِ حجت کر دی ہے اس نے اور قیامت میں وہ TESTIFY کر دے گا کہ اے اللہ! تیرا دین، تیری ہدایت جو مجھ تک پہنچی تھی، میں نے بلاکم و کاست اُن کے سامنے پیش کر دی۔ اب یہ جواب دہ ہیں خود، یہ مسئول ہیں اپنے طرزِ عمل کے، یہ پورے طور پر ذمہ دار ہیں اپنے طرزِ عمل کے۔ یہ لاعلمی کا بہانہ نہیں بنا سکتے۔ یہ گواہی خلاف پڑنے والی ہے اور اس دور کی مروجہ اصطلاحات میں کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء و رُسُل سرکاری گواہ کی حیثیت سے پیش ہوں گے۔ PROSECUTION WITNESSES کی حیثیت سے اُن کی حاضری ہوگی: فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ط (آپ کو ان کے خلاف گواہ بنا کر کھڑا کریں گے) اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آئے ہیں۔ مشہور واقعہ ہے حضورؐ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمائش کی کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا حضورؐ! آپ کو سناؤں؟ آپ پر تو قرآن نازل ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں! مجھے دوسروں سے سُن کر کچھ اور لطف آتا ہے۔ اب تعمیل امر میں انہوں نے سورۂ نساء

پڑھنی شروع کی، وہ نگاہیں نیچے کئے ہوئے پڑھ رہے ہیں، حضورؐ سُن رہے ہیں، جب اس آیت پر پہنچے تو حضورؐ نے فرمایا: حسبك حسبك بس کرو، بس کرو۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ مَیں نے جو نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ؀

اب آپ نوٹ کیجئے یہ قافلۂ نبوّت و رسالت چلتا رہا، اللہ کے رسول آتے رہے، حجّت قائم کرتے رہے۔ اسی فلسفۂ رسالت کے اعتبار سے یہ مسئلہ بھی اہم ہے کہ رسول کے آنے کے بعد چونکہ حجّت آخری درجے میں قائم ہوجاتی تھی لہٰذا جس قوم کے پاس رسول بھیج دیا جاتا تھا، اب اس کو کوئی رعایت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کے لئے گویا آخری عدالت کا فیصلہ بن کر رسول آتا تھا۔ جب تک رسول نہیں آیا کوئی عذر باقی ہے، رسول کے آنے کے بعد، ہدایت کے اس طرح مبرہن ہوجانے کے بعد، حق کے اس طرح منکشف ہوجانے کے بعد، قولاً اور عملاً حجت قائم ہوچکنے کے بعد اب بھی اگر کوئی قوم اپنے کفر پر، اپنے انکار پر اڑی ہوئی ہے تو اب وہ کسی رعایت کی مستحق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسولوں کے باب میں اللہ کی سُنّت یہ رہی ہے کہ جس قوم کی طرف رسول بھیج دیا گیا اور اس کے باوجود وہ کفر پر، شرک پر، کجروی پر اڑی رہی تو اس کو نیست و نابود کردیا گیا۔ اس کو قرآن مجید کبھی تعبیر کرتا ہے کہ: "كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا" (وہ ایسے ہو گئے کہ کبھی وہاں تھے ہی نہیں) لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ (اب نہیں دکھتے مگر اُن کے مسکن!) مکین نہیں رہے صرف مکان رہ گئے کھنڈرات کی شکل میں جو اپنے رہنے والوں کی عبرت ناک داستان سنا رہے ہیں۔ قومِ نوح پر، قومِ ہود پر، قومِ صالح پر، قومِ لوط پر، قومِ شعیب پر اور آلِ فرعون پر اللہ تعالیٰ کی اسی سُنّت، اللہ تعالیٰ کے اسی قانون کے تحت عذاب آیا۔ یہ معاملہ ایک اعتبار سے بڑا اہم ہے۔ حضرت مسیح بھی رسول تھے۔ قرآن مجید میں صاف لکھا ہے: رَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ۔ مَیں نے ابتدا میں عرض کیا تھا نبوّت و

رسالت کا فرق، اس کو یہاں بھی سمجھ لیں، نبی اپنی ذات میں نبی ہے رسول وہ اس وقت ہوا جب کسی قوم کی طرف تعیّن کے ساتھ اسے مبعوث کر دیا گیا۔ نبی کے لئے یہ شرط لازم نہیں ہے کہ وہ ضرور غالب ہو کر رہے، نبی مغلوب بھی ہو سکتا ہے، نبی قتل بھی ہو سکتا ہے۔ حضرت یحییٰ قتل ہو گئے۔ رسول کبھی مغلوب نہیں ہوتا، وہ تو حکومت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ ایک سی۔ ایس۔ پی اپنی جگہ جو کچھ بھی ہے، ابھی اُس نے کہیں ڈی۔ سی کی حیثیت سے چارج نہیں لیا، چارج لے گا تو اب اُس کی عزّت حکومت کی عزّت ہو جائے گی، اُس کا وقار، حکومت کا وقار ہوگا، وہ نمائندہ ہے حکومت کا۔ نبی، نبی ہونے کی حیثیت سے اپنا ایک رُتبہ رکھتا ہے، اُس کا یہ رُتبہ بہت بلند ہے۔ لیکن اُس کے معاملے میں اللہ کا وہ قانون نہیں ہے، نبی مغلوب ہو سکتا ہے، نبی قتل ہو سکتا ہے اور ہوئے۔

بنی اسرائیل کے جو جرائم ہیں جن کی پاداش میں : ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ اِن میں انبیاء کا قتل بھی شامل ہے، لیکن رسولوں کا نہیں کیونکہ ارشادِ خداوندی ہے : كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ (اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب آ کر رہیں گے!)

رسول مغلوب نہیں ہو سکتا، حضرت نوح علیہ السّلام نے یہی تو فریاد کی تھی کہ : رَبِّ اِنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (اے اللہ! میں تو مغلوب ہوا چاہتا ہوں، مدد فرما!) پھر مدد آئی، پوری قوم کو نیست و نابود کر دیا گیا : وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝

تو رسولوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آتے ہیں تو قوم کے لئے عدالت بن کر آتے ہیں۔ قوم انکار کرتی ہے تو اس کو نیست و نابود کر دیا جاتا ہے اور رسول غالب رہتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السّلام کے بارے میں اگر یہ نہ مانا جائے کہ ان کو

دوبارہ دنیا میں آنا ہے جسے 'عقیدۂ نزولِ مسیح' کہا جاتا ہے تو یہ قانون ٹوٹتا ہے - وہ تو پھر مغلوب ہوئے اور جس قوم کی طرف انہیں بھیجا گیا وہ اپنے کفر کے باوجود نیست و نابود نہیں ہوئی، کفر بھی کیسا کفر، اللہ کے جلیل القدر پیغمبر کو کافر انہوں نے کہا، مرتد انہوں نے کہا، جادوگر انہوں نے کہا۔ اپنی حد تک تو سولی پہ چڑھا کر دم لیا اور پھر بھی وہ موجود - یہ قانون اٹل ہے، در حقیقت اس کو ابھی پورا ہونا ہے - صرف یوں کہئے کہ وہ RESER - VED JUDGEMENT ہے - اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ مدت کوئی بڑی طویل مدت نہیں - وہ فیصلہ ہوگا اور اسی رسول کے ہاتھوں ہلاک و برباد ہوں گے - وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے ❊ یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ آدم کے صفات

ہمارے ہاں ایک شوشہ چھوڑا گیا ایک جھوٹی نبوت کے لئے راستہ ہموار کرنے کیلئے کوئی مثیلِ مسیح نہیں - مسیح ابنِ مریم، عیسیٰ ابنِ مریم آئیں گے، اور یہ قانون متقاضی ہے کہ انہیں کے ہاتھوں یہودیوں کو سزا ملے، اور احادیث میں انہی کے ہاتھوں سزا کی شرح ملتی ہے - ان یہودیوں کا جو آخری انجام ہے یا جس کیفرِ کردار کو دنیا میں یہ پہنچیں گے - حضرت مسیح کے ہاتھوں اس کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے - ہر وہ پتھر جس کے پیچھے کوئی یہودی چھپے گا وہ پکار کر کہے گا: "اے روح اللہ! یہ یہودی ہے جو میرے پیچھے چھپا ہوا ہے" اور مقامِ لُد پہ دجّال کو حضرت مسیح قتل کریں گے - یہ وہی لیڈ ہے جو ان کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ ہے جہاں سادات ابھی جا کر اترے تھے - جب وہ یروشلم گئے تھے - حدیث میں اس کے لئے لفظ لُد آیا ہے - دجّالِ اکبر وہاں سے بھاگنے کی فکر میں ہوگا - اور حضرت مسیح اس کو مار دیں گے - بہرحال یہ علمی مسئلہ تھا - میں نے چاہا کہ اسی نبوت و رسالت کی جو بحث آج آئی ہے اس کے حوالے سے اس کو بھی واضح کر دوں - اب لوٹئے اصل مضمون کی طرف :

قافلۂ نبوت و رسالت چلتا رہا اور میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے نزدیک تاریخ نبوت، تاریخِ آدمیت ہے - قافلۂ انسانیت بھی چل رہا ہے، انسان

بھی کچھ منزلیں طے کر رہا ہے۔ دو اعتبارات سے اس کو ذہن میں رکھئے جس سے کہ ختم نبوّت کا تعلق آئے گا اور میں نے آج بھی عرض کیا، کل بھی اس کو ذرا تفصیل سے بیان کروں گا۔ کہ اگرچہ صد فی صد درست ہے کہ حضورؐ پر نبوّت ختم ہوگئی، کوئی شک نہیں لیکن اس کا ایک اہم تر پہلو ہے۔ بدقسمتی سے اس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی، صرف ختم نہیں ہوئی نبوّت و رسالت کا حضورؐ پر اتمام ہوا ہے، تکمیل ہوئی ہے۔ مجرد ختم ہو جانا فضیلت نہیں ہے۔ سوچئے بلکہ اس پر تو منطقی طور پر اعتراض بھی وارد ہو سکتا ہے کہ ایک فضیلت تھی جس کو ختم کر دیا گیا، سلسلۂ فیض تھا جو بند ہو گیا، اس لئے صرف ختم نہیں بلکہ ختم ہوا ہے معاملہ اتمام کو پہنچنے کے بعد، اکمال کو پہنچنے کے بعد:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔

یہ دونوں الفاظ قرآن کے ہیں اکمال بھی، اتمام بھی اور حضورؐ نے جو تشبیہ دی ہے آپ نے سنی ہوگی کہ میری ختم نبوّت کی مثال ایسی ہے جیسے بہت بڑا محل تعمیر کیا گیا۔ اس میں ایک جگہ کوئی رخنہ تھا، لوگ دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ اس عمارت میں یہ خلا کیوں چھوڑ دیا گیا، میرے آنے سے وہ خلا پُر ہو گیا، قصرِ نبوّت مکمّل ہو گیا۔ رسالت کی عمارت اپنے تکمیلی مرحلے کو پہنچ گئی۔

اتمام و تکمیل کے دو پہلو بڑے اہم ہیں، ایک طرف قافلۂ نبوّت، اور ساتھ ساتھ قافلۂ انسانیت۔ قافلۂ انسانیت نے دو اعتبارات سے عہدِ طفولیت سے نکل کر عہدِ بلوغت میں قدم رکھا۔ ایک طرف عقلی و فکری اعتبار سے۔ انبیاءؑ کا معاملہ ایک طرف رکھئے، ان کو اللہ تعالیٰ شعور یعنی شعورِ نبوّت جو عطا کرتا ہے وہ ایک EXCEPTIONAL چیز ہے۔ بحیثیتِ مجموعی اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نسلِ انسانی نے عقل کے ارتقائی مراحل طے کئے۔ شعورِ نبوّت وہبی ہے، کسبی نہیں ہے۔ اگر حضرت آدمؑ کو پورا شعور عطا کیا تو اس میں کوئی تعجب والی بات نہیں ہے۔ یہ کوئی دقیق مسئلہ نہیں ہے اس قاعدہ کلیہ سے صرف ایک استثنائی صورت ہے۔ بحیثیتِ مجموعی اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نسلِ انسانی نے عقلی بلوغ کے لئے منزلیں طے کی ہیں۔ دوسری

طرف انسان نے اجتماعی سفر طے کیا ہے، تمدّن کا سفر طے کیا ہے، مل جل کر رہنے کا نظام بنایا ہے اور اس کے بھی تدریجی مراحل ہیں۔ سوچ، فکر، عقل اس کا بھی ارتقائی سفر ہے اور اجتماعیت، تہذیب، تمدّن اِس کا بھی ایک سفر ہے۔ جو قافلۂ انسانی طے کر رہا ہے۔ اور آج سے چودہ سَو برس قبل وہ وقت آیا کہ محمدؐ عربی کی بعثت ہوئی۔ ایک سوال یہاں پیدا ہو سکتا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ سوال پیدا ہوتے ہیں تو علم آگے بڑھتا ہے۔ سوچ تب ترقی کرتی ہے جب سوال سامنے آتا ہے۔ کوئی سوال ہی نہ ہو تو فہم میں، قوّتِ نظری میں، قوّتِ فکری میں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ کیا سبب ہے کہ یہ وقت تھا جو منتخب کیا گیا آخری نبوّت، کامل نبوّت آخری رسالت کے لئے۔ آج سے چودہ سو برس قبل کا وقت کیوں مقرّر کیا گیا۔ ایک ہزار سال پہلے کیوں نہیں یا ایک ہزار سال بعد کیوں نہیں۔ اللہ کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں: (فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ) سوال سامنے رکھئے، جواب تلاش کیجئے، شاید حکمتِ خداوندی سے کچھ حصّہ میسّر آجائے۔

ایک بات جو اس مرتبہ سیرت کانفرنس میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کے مقالے کا موضوع تھی (اگرچہ وہ مقالہ غالباً انہوں نے پیش ہی نہیں کیا کچھ اور ہی تقریر کی) بڑی اہم بات ہے اور کہہ بھی وہی سکتے تھے۔ ان کا مذاہب و فلسفہ دونوں کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اچانک انہوں نے یہ بات ایک مرتبہ میرے سامنے بیان کی اور مَیں نے ان کو توجّہ دلائی کہ اس بات کا تعلّق براہِ راست ختمِ نبوّت سے ہے۔ تاریخ اسلامی کے بارہ تیرہ سو سال بڑے اہم ہیں، اس اعتبار سے کہ انسان نے حقیقتِ نفس الامری تک رسائی کے لئے جو کوشش کی ہے، جو سعی کی ہے، سوچا ہے، غور کیا ہے، جس کے نتیجے میں مذاہب پیدا ہوئے، مکاتبِ فلسفہ وجود میں آئے، یہ سب کچھ آپ کو نظر آئے گا۔ ۶۰۰ یا ۷۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۶۰۰ بعد مسیح تک۔ یونان میں سوچا جا رہا ہے، ہندوستان میں سوچا جا رہا ہے، چین میں سوچا جا رہا ہے، ایران میں سوچا جا رہا ہے۔ سوچ کے تو یہی مرکز ہیں۔ ویسے تو انسانی تہذیب و

تمدّن کے اعتبار سے مصر کا بھی ایک مقام ہے لیکن جسے سوچ کہا جائے، جسے واقعتہً فکر کا نام دیا جا سکے، اس کے یہ چار ہی مراکز دنیا میں ہیں۔ یونان ہے، ایران ہے، ہندوستان ہے، چین ہے۔ یہیں مذاہب پیدا ہوئے، فلسفے پیدا ہوئے۔ ہر اعتبار سے انسان نے سوچ لیا اور اُن کا کہنا یہ ہے کہ اس کے بعد کوئی نیا زاویۂ نگاہ، کوئی نیا فکر بالکل وجود میں نہیں آیا۔ یہ جو جدید فلاسفی ہے یورپ کی MODERN PHYLOSOPHY یہ صرف صدائے بازگشت ہے۔ وہی فلسفے ہیں، وہی نظریات ہیں۔ ان کو انسان دوبارہ کھنگال رہا ہے نئی بوتلوں میں نئے لیبلوں کے ساتھ وہ فلسفے آئے ہیں۔ فلسفہ مکمّل ہو چکا تھا۔ جب کہ محمدؐ عربی صلّی اللہ علیہ وسلّم تشریف لائے۔ گویا کہ اب وہ وقت آیا کہ انسان کو وہ آخری ہدایت نامہ دے دیا جائے، کیونکہ وہ سب کچھ سوچ چکا، جس قدر بھی صلاحیّت انسان میں بحیثیّت انسان تھی وہ بروئے کار آچکی۔ اب اس کی سوچ کے لئے، اس کی فکر کے لئے آخری اور کامل ہدایت نامہ عطا کر دیا اور ایک دوسرے پہلو سے کہ نوعِ انسانی نے اجتماعیّت کی طرف سفر کی متعدّد منزلیں طے کر لیں۔ انسان کبھی قبیلوں کی شکل میں رہتا تھا۔ ابھی چھوڑیئے اس دور کو جب ابھی قبیلوں کی شکل بھی نہ ہوئی ہو۔ اجتماعیّت کا نقطۂ آغاز قبائلی نظام (TRIBAL SYSEM) ہے۔ اب یہ بات اور ہے کہ ہمارے ہاں اب تک وہ موجود ہے۔ ہمارے پاس وہ علاقے اب تک ہیں جہاں سب سے بڑا سیاسی مسئلہ یہ ہے کہ وہاں کا نظام ابھی تک اسی قبائلی نظام کے اوپر قائم ہے۔ یہ سب سے زیادہ ابتدائی FORM ہے انسانی اجتماعیّت کی۔ قبیلہ ایک مکمّل پولٹیکل یونٹ بھی ہے۔ مکمّل معاشرتی یونٹ بھی ہے، معاشی یونٹ بھی ہے۔ گویا کہ کل اجتماعیتِ انسانیہ نے ایک قبیلہ کی شکل اور ہیئت اختیار کر لی ہے۔ اس سے آگے چلئے! کچھ قبیلوں نے مل جُل کر رہنا شروع کیا ایک شہر میں، تو شہری ریاستیں وجود میں آئیں۔ یہاں یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ حضورؐ کی بعثت کے وقت مکہ مکرمہ قبیلے کی سطح پر زندگی بسر کر رہا تھا، صرف ایک قبیلہ۔ مدینہ منورہ اس سے اگلے قدم پر تھا یہ ایک شہری ریاست تھی۔ پانچ قبیلے وہاں آباد تھے اور ان کے آپس کے معاملات

طے ہوتے تھے تو اُن کے اُصول معیّن تھے۔ ایک CONSTITUTION کہہ لیجئے ابتدائی فارم میں، چاہے وہ لکھا ہوا نہ ہو، لکھے ہوئے دستور تو اب بھی دنیا میں جو بڑی بڑی مملکتیں ہیں، اُن کے ہاں بھی نہیں ہیں ؛

جس وقت حضورؐ کی بعثت ہوئی، آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں عظیم مملکتیں قائم تھیں۔ سلطنتِ فارس، سلطنتِ روما، یہ جھولا جھولتی رہتی تھیں۔ کبھی اِس کو عروج حاصل ہوا تو کبھی اُس کو، کبھی وہ ذرا پیچھے ہٹ گئی تو کبھی یہ۔ یہ مغربی ایشیا، یہ شام اور فلسطین اور یہ ترکی کا علاقہ۔ یہ گویا کبھی اِدھر ہوتا تھا تو کبھی اُدھر: الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝ ان کے درمیان یہ رہتا تھا کہ کبھی یہ آگے بڑھے تو وہ پیچھے ہٹ گئے، کبھی وہ آگے بڑھے تو یہ پیچھے ہٹ گئے۔ مذکورہ دو عظیم مملکتیں، دو عظیم سلطنتیں کئی سو برس تک دُنیا میں قائم رہیں۔ یہاں بھی اجتماعیتِ انسانی نے وہاں تک سفر طے کر لیا تھا۔ اس کے بعد میں عرض کر دوں کہ انسانیت نے صرف ایک۔ قدم اور آگے بڑھایا۔ یہ تھا CONCEPT OF STATE یعنی تصوّرِ ریاست۔ اسے قبائلی نظام سے آگے ایک قدم کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جب حضورؐ کی بعثت ہوئی ہے تہذیب و تمدّن، اور اجتماعیتِ انسانیہ اس سطح پر پہنچ چکے تھے کہ گویا ایک جدید دور کا آغاز ہونے والا تھا، جبکہ اجتماعی گرفت انسان کی زندگی پر فیصلہ کُن ہو چکی تھی۔ انفرادیّت کی جگہ اجتماعیّت لے چکی تھی۔ اس وقت بعثت ہوئی حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی۔ اب اس میں یہی اتمامِ حجّت جو رسالت کا اصلی بنیادی مقصد ہے وہی شہادت علی النّاس ہے، جس کے لئے تمام رسول مبعوث ہوئے۔ بنیادی طور پر حضورؐ کا مقصدِ بعثت بھی وہی ہے لیکن اس کی DIMENSIONS بدل رہی ہیں۔ انسان نے عہدِ طفولیّت سے قدم نکال کر بلوغت اور پختگی کی عمر میں قدم رکھا ہے۔ قافلۂ انسانیّت ابتدائی منزلیں طے کر کے اب اس دورِ جدید میں قدم رکھ رہا ہے، اس وقت بعثت ہوئی محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی، اتمامِ رسالت کے بعد

سیرۃ نبویؐ قرآن کریم کی روشنی میں

مولانا وصی مظہر صاحب ندوی مدرسہ عربیہ اسلامیہ حیدر آباد

(۱)

انذار دعوت کے ابتدائی دور میں

سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات کی روشنی میں ہم معلوم کر چکے ہیں کہ نبوت کے بالکل ابتدائی دور میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کام کے سلسلہ میں کیا ہدایات دی تھیں۔ ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہدایات کی سختی کے ساتھ پابندی کی۔ لہٰذا آپؐ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ ہم انہی قرآنی ہدایات کی روشنی میں بآسانی کر سکتے ہیں ؛

اِنذار اور تبشیر | نبوت کے ابتدائی دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے مقدم کام "اِنذار" تھا۔ اِنذار کے معنی ہیں: "آنے والے خطرہ سے باخبر کر دینا!" انذار کے اندر "تبشیر" یعنی اچھے مستقبل کی خوشخبری دینا خود بخود شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کو اللہ تعالیٰ نے مُبَشِّر اور مُنذِر دونوں صفات کے ساتھ یاد فرمایا ہے اور موقعہ کی مناسبت سے کہیں دونوں صفات کا ذکر ہے کہیں کسی ایک صفت کا، پھر کہیں ایک صفت کو مقدم کیا گیا ہے تو کہیں دوسری صفت کو۔

اِنذار کے باب میں انبیاء کی سُنّت | حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب رسالت کا فرض ادا کرنا شروع کیا تو آپؐ کو صرف "انذار" کا حکم دیا گیا تھا اس کی وجہ جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا جا چکا ہے، یہ ہے کہ اگر کوئی معاشرہ اپنے حال پر خوش اور مطمئن ہو اور مستقبل کے بارے میں قطعاً فکر مند نہ ہو تو وہ اپنے حال کو بدلنے پر بھلا کب راضی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے انبیاء علیہم السّلام کا اصل اور ابتدائی کام ہمیشہ "اِنذار" ہی کا کام ہوتا ہے۔ وہ نہایت شدید اور چونکا دینے والے انذار اور جھنجھوڑ کر رکھ دینے والی عبارتوں سے اِن "حال مست" اور "مال مست" افراد کو مستقبل کی فکر کرنے پر آمادہ کرتے ہیں ؛

انذار کی حکمت اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے معاشرہ کے ایسے افراد جو ذاتی مفادات کے تحفظ سے بالاتر ہوتے ہیں، جو تقلید آباء کے بجائے خود اپنی عقل و فکر سے بھی کام لیتے ہیں اور جو شعور اور احساس کی نعمت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ وہ انبیاء علیہم السلام کے انذار سے بیدار ہو جاتے ہیں اور معاشرہ کو تباہی سے بچانے کے لئے غلط اور خطرناک بنیادوں کو ڈھانے اور صحیح بنیادوں پر اس کی تعمیر کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہی باحوصلہ لوگ آگے بڑھتے ہیں اور ہر قسم کی آزمائشوں اور تکلیفوں کو ہنستے مسکراتے برداشت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جاہلی معاشرہ مکمل طور پر ایک اسلامی معاشرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے ؛

ابتدائی دور میں دعوت کا طریقہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء میں کھلم کھلا دعوت پہنچانے کا حکم نہ تھا۔ جیسا کہ آیت : فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (ہانکے پکارے کہہ دیجئے وہ بات جس کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے!) سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس آیت کے بارے میں اکثر مفسرین کا اتفاق ہے کہ وہ نبوت کے ابتدائی تین سال کے بعد نازل ہوئی تھی اور اسی آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام دعوت کا آغاز فرمایا۔ ابتدائی دور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ پر ایمان لانے والے اصحاب انفرادی ملاقاتوں اور شخصی روابط کے ذریعہ اس دعوت کو پھیلانے کی کوشش کرتے رہے۔ تین سال کی اس مدت میں ابن ہشام کے بیان کے مطابق جو لوگ ایمان لائے، اور اللہ کی بڑائی کو قائم کرنے کے لئے جنھوں نے ہر قربانی کا عزم کر لیا، ان کی تعداد بچاس سے زائد ہو چکی تھی۔ ان ابتدائی ایمان لانے والوں میں قریش کی سب سے مالدار خاتون حضرت خدیجہؓ، بنی ہاشم کے سردار جناب ابوطالب کے بیٹے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردہ حضرت علیؓ، قریش کے سب سے سنجیدہ باوقار اور صاحب کردار تاجر حضرت ابوبکرؓ (جو قبائل عرب کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات رکھتے تھے) فاتح ایران حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ فاتح شام حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح، اور فقہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود جیسے ممتاز اصحاب شامل ہیں ؛

اس دور میں حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ پر ایمان لانے والوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ ایسے افراد کو منتخب کیا جن سے اُن کے شخصی روابط تھے۔ ان کو آخرت فراموشی اور دُنیا پرستی کے خوفناک نتائج سے آگاہ کیا، شرک کو چھوڑ کر توحید پر ایمان لانے کی دعوت دی ؛

تین سال کی اس مدّت میں قریش کو اگرچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت کا علم ہو چکا تھا لیکن وہ عام طور پر حضورؐ کی دعوت کو اپنے لئے کوئی خطرہ تصوّر نہ کرتے تھے۔ چنانچہ نوجوانوں کو اس نئے دین کے مطابق عبادت کرتے ہوئے اگر کوئی بڑا بوڑھا دیکھ لیتا تو یا تو اُن کی کچھ حوصلہ افزائی کر دیتا یا کچھ ڈانٹ ڈپٹ دیتا تھا!

ابتدائی دور میں قرآنی سورتوں کا عمومی انداز | قرآن مجید کی جو سورتیں اس زمانے میں نازل ہوئیں مثلاً سورۂ مدّثر، سورۂ مزّمل، سورۂ علق، یا سورۂ ضحیٰ وغیرہ ان میں یا تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو تسکین اور تسلّی دی گئی تھی۔ اس عظیم الشان کام کو انجام دینے کے لئے ضروری ہدایات دی گئی تھیں اور یا پھر ان میں "انذار" کی شان نمایاں تھی ؛

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حوصلہ افزائی کے لئے قرآن مجید کی جو سورتیں اس زمانے میں اتریں اُن کے بارے میں اِن شاء اللہ ایک مستقل حلقے میں بات ہوگی اس وقت ہم سورۂ علق کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ اور آپؐ کے ساتھی اس جاہلی معاشرے کے منتخب افراد کو گمراہی سے نکالنے اور راہِ ہدایت پر لانے کے لئے چونکانے اور بیدار کرنے کا کیا انداز اختیار کیا کرتے تھے :

"پڑھ اپنے ربّ کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون سے انسان کی تخلیق کی، پڑھ اور تیرا ربّ بڑا محترم اور مہربان ربّ تو وہ ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جو وہ نہ جانتا تھا!" ـــــ "ہرگز نہیں (جاہلیت کا طریقہ اُس ربّ کا پسندیدہ طریقہ نہیں بلکہ) واقعہ یہ ہے کہ انسان (خود) سرکشی کرتا ہے، اس لئے کہ

وہ اپنے آپ کو بے نیاز پاتا ہے (حالانکہ) واقعہ یہ ہے کہ تیرے ربّ ہی کی طرف پلٹنا ہوگا!"

"کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندہ کو منع کرتا جب وہ (بندگی کے لئے) نماز پڑھتا ہے۔ (اے مخاطب) تیرا کیا خیال ہے، اگر یہ بندہ ہدایت پہ ہوا یا وہ پرہیز گاری اختیار کرنے کا داعی ہوا۔ (ہاں) تمہارا کیا خیال ہے (کہ پھر بھی) اگر یہ جھٹلائے اور منہ موڑے (تو اس شخص کا انجام کیا ہوگا!"

"کیا اسے یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ (سب کچھ) دیکھ رہا ہے۔ ہرگز نہیں (اُس کی یہ شرارت جہالت کے باعث نہیں!) اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے (ہاں اسی) پیشانی (کے بالوں کو) جو جھوٹی اور گنہ گار ہے، وہ بلالے اپنے حامیوں کے لٹھے کو، ہم بلائیں گے عذاب کے فرشتوں کو!"

"ہرگز نہیں (وہ بچ کر نہیں جاسکتا) تم اس کے پیچھے نہ چلو اور سجدہ ریز ہو کر اپنے ربّ کا قرب حاصل کرو!"

دیکھئے! اِن آیاتِ مبارکہ میں انسانوں کی سرکشی کے بنیادی سبب (یعنی بظاہر بے نیاز ہونا!) کو بیان کرنے کے بعد کس طرح ایسے مغرور اور متکبّر انسان کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جو دوسرے بندوں کو بھی اپنے ربّ کی بندگی سے روکتا ہے اور نیکی اور تقویٰ کی دعوت سننے تک کا روادار نہیں ہے۔

پھر ایسے شخص کے انجامِ بد سے باخبر کرنے کے بعد اس سے دُور رہنے اور اپنے ربّ سے قریب تر ہو جانے کی ہدایت کتنے مؤثّر انداز میں دی گئی ہے۔ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے اصحاب نے "انذار" کے اسی اسلوب کو ابتدائی برسوں میں اختیار کر رکھا تھا۔ اور اسی اسلوب سے متأثّر ہو کر باصلاحیت، اور حوصلہ مند نوجوانوں نے اس دعوت کو قبول کیا تھا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(۲)

اِنذار کے اوّلین مخاطب

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق تین سال تک انفرادی تعلّق اور شخصی رابطے کے ذریعہ دعوت پہنچانے کا کام انجام دیا۔ اس زمانے میں حضورؐ کی دعوت پر "اِنذار" کا رنگ غالب تھا۔ اس دور کے اختتام سے قبل آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو حکم دیا گیا:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ — تمہارے خاندان میں جو تم سے جتنے زیادہ قریب ہیں، ان کو آنے والے خطرے سے باخبر کرو

اِنذار میں صداقت کی کسوٹی | انبیاء علیہم السّلام اور ان کے سچّے پیروؤں اور اصلاح کے جھوٹے علم برداروں کے درمیان فرق کرنے والی جو بہت سی نشانیاں ہیں، اُن میں سے ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ حضراتِ انبیاء اور ان کے طریقے پر چلنے والے بندگانِ خدا جس برائی سے منع کرتے ہیں اس سے خود دُور رہتے ہیں اور جو شخص ان کو جتنا زیادہ پیارا ہوتا ہے، اس کو وہ اتنا ہی زیادہ اس برائی سے بچانے کے لئے فکرمند ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ باہر تو برائی کے خلاف محاذ قائم ہو اور نیکی کا پرچار کیا جارہا ہو اور گھر کے قریب ترین لوگوں کو اُس برائی سے بچانے کی کوئی فکر ہی نہ ہو۔

اِنذار اقربین کی چند مثالیں | یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے دعوت میں ابتداء ہی سے اپنے قریب ترین لوگوں پر زیادہ توجّہ دے رہے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کے بعد کہ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو متنبّہ کرو آپ نے خاص طور پر اپنے رشتہ داروں کی طرف توجّہ دی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس سلسلہ میں اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو مختلف دعوتوں میں بلایا۔ ایک دعوت میں آپ نے صرف عبدالمطلب کے گھرانے کے ۴۰ افراد کو مدعو کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

یا بنی عبد المطلب لو اخبرتکم ان فی سفح ھذا الجبل خیلا اکنتم

مصدقی ؟ قالوا نعم ! قال فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید
("اے عبدالمطلب کے اہل خاندان ! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں سواروں کا ایک دستہ (تمہاری گھات میں) ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے ؟ سب نے بالاتفاق جواب دیا "ضرور!" تو آپؐ نے فرمایا کہ میں تم کو ایک شدید عذاب آنے سے قبل باخبر کرنا چاہتا ہوں !")

اسی طرح آپ نے ایک بار بالخصوص اپنے اہل خاندان کی دعوت کی اور کھانے کے بعد خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

ان الرّائد لایکذب اھلہ، واللّٰہ لوکذبت الناس جمیعًا لما کذبتکم ولوغررت النّاس جمیعًا لما غررتکم واللّٰہ لتموتن کما تنامون، ولتبعثن کما تستیقظون وتجزون بالاحسان احسانا وبالسوء سوءا وانھا للجنۃ ابدًا او النار ابدا۔ وانکم لاول من انذر بین یدی عذاب شدید ٥

"یقیناً قافلے کے لئے اگلی منزل کی بابت خبر لانے والا خود اپنے خاندان والوں کو کبھی جھوٹی رپورٹ نہیں دیتا۔ خدا کی قسم اگر میں سب دنیا والوں سے جھوٹ بولتا تب بھی تم سے تو جھوٹ نہ بولتا، اور اگر میں ساری دنیا کو دھوکا دیتا جب بھی تم کو دھوکا نہ دیتا۔ خدا کی قسم تم ایک دن مرجاؤ گے، جیسے سوجاتے ہو، پھر تم کو اٹھایا جائے گا، جیسے کہ تم جاگ جاتے ہو اور تم کو اچھے کاموں کا اچھا بدلہ اور برے کاموں کا برا بدلہ مل کر رہے گا۔ اور پھر یا ہمیشہ ہمیش کی جنت ہوگی اور یا ابدالآباد کے لئے جہنم۔ (یاد رکھو!) تم کو آنے والے شدید عذاب سے قبل سب سے پہلے باخبر کیا جا رہا ہے!")

ایک بار آپ نے کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کے ایک ایک گھرانے کو نام لے لے کر پکارا اور اس طرح مکہ کا سب سے بڑا اجتماع طلب کر کے اُن کو آنے والے خوفناک لمحات سے آگاہ کیا۔

فریضۂ انذار کی ادائیگی میں اہتمام | قرآن مجید شہادت دیتا ہے کہ اس زمانے

میں آپ اپنی قوم اور اہل خاندان کے بارے میں انتہائی فکرمند تھے اور ان کو سیدھے راستے پر لانے کے لئے دن رات زبردست محنت اور مشقت کرتے تھے :

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ط

(" تو شاید آپ رنج کی وجہ سے اپنی جان اُن کے پیچھے دے دیں گے، اگر وہ اِس حقیقت پر ایمان نہ لائے !")

خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک مثال کے ذریعہ اپنے اضطراب کو واضح فرمایا ہے کہ تم پروانوں کی طرح آگ کے شعلوں میں گرنا چاہتے ہو اور میں تمھاری کمر پکڑ پکڑ کر اس آگ سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

انفرادی دعوت کے اس دور میں علانیہ دعوت کی تیاری کے لئے خود نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والے اصحاب کو قیام اللیل کا حکم دیا گیا۔ تاکہ مناجاتِ شب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو۔ نفس کو ایمان و شعور کے تابع بنایا جائے اور قرآن مجید کے فہم و تدبّر کے لئے اس کو رات کی خاموشیوں میں ترتیل کے ساتھ پڑھا جائے۔

چنانچہ سورۂ مزّمل میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم بلکہ آپ کے واسطے سے دراصل تمام داعیانِ حق کو کہا گیا ہے کہ وہ لوگ جو اس عظیم الشّان دعوت کے علمبردار ہوں، اُن کے لئے چادر تان کر سو جانا کسی طرح روا نہیں ہے۔ ان کو تو شب بیداری کے آداب سیکھنا چاہئیں۔ اور رات کا بیشتر حصّہ اپنے ربّ کے سامنے کھڑے ہو کر تلاوتِ آیات اور مناجات میں بسر کرنا چاہیئے، تاکہ وہ اس قولِ ثقیل یعنی اُس عظیم ذمّہ داری کے بوجھ کو اُٹھا سکیں۔ جو دعوتِ حق کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ڈالی ہے۔ یہ رات کا اٹھنا نفس کو قابو میں لانے کا بہترین ذریعہ ہے، اور اُس وقت جو بات کی جائے وہ سیدھی دل میں اُترتی ہے۔ لہٰذا اس وقت قرآنِ حکیم کو ٹھہر ٹھہر کر ترتیل کے ساتھ پڑھنا چاہیئے تاکہ اُس کے معانی اور مطالب دل میں اُترتے چلے جائیں۔

پھر اس وقت اللہ کی رحمت بھی متوجّہ ہوتی ہے۔ چنانچہ آدمی اپنے لئے

یا خلق کی بھلائی کے لیۓ جو دعائیں مانگتا ہے وہ مقبول ہوتی ہیں۔

ان ہدایات کے تحت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے اصحاب نصف شب یا اُس سے کم و بیش قیام اللّیل کی پابندی کرتے تھے، جس کی وجہ سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے ساتھیوں کے قدم بعض دفعہ متورّم ہوجاتے تھے :

قیام اللّیل کے اسی حکم پر عمل کرنے کے انداز کے بارے میں خود قرآن شہادت دیتا ہے کہ :

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ	یقیناً تمھارا ربّ جانتا ہے کہ تم رات کی دو تہائی یا اُس کا نصف یا اُس کی ایک تہائی (اپنے ربّ کے سامنے) کھڑے ہوتے ہو اور تمھارے ساتھیوں میں سے بھی ایک جماعت اس قیام میں تمھاری شریک ہے۔

دعوتِ حق کے ساتھ یہ قیام اللّیل بے حد لازمی شئے ہے۔ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے تعلّق مضبوط ہوتا ہے۔ لیڈری اور مشیخت جمانے کے بجائے تواضع اور شکرِ نعمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اپنی طاقتِ لسانی اور کوششوں پر اعتماد کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید پر اعتماد بڑھتا ہے۔ رات کو دعا کرتا ہے، دن کو اس کی قبولیت کا مشاہدہ کرتا ہے، لذّتِ آہِ سحر گاہی سے آشنا ہوتا ہے، ندامت کے آنسوؤں سے کوتاہیوں کے داغ دھوتا ہے، اور نام و نمود کی بجائے اصل مقصود یعنی رضائے الٰہی پر نگاہیں مرکوز کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پس اہلِ دعوت کے لئے قیامُ اللّیل وہ غذا ہے جس سے وہ کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ اس کی لذّت سے ہم سب کو آشنا کردے۔ آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اخلاقِ نبویؐ

سیّد خورشید احمد صاحب گیلانی

"اخلاق" دین اسلام کی ایک مکمل اور جامع اصطلاح ہے۔ اس سے مراد محض خوش روئی خوش کلامی اور خندہ پیشانی نہیں بلکہ یہ وہ آئینہ ہے جس میں انسانی زندگی کی پوری تصویر جھلکتی نظر آتی ہے۔ فرد سے اجتماع اور ذات سے معاشرے تک اس کا نفوذ اور اثر ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا مفید اور حسین پہلو نہیں جو اخلاق کے دائرے میں شامل نہ ہو۔ اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے، اوڑھنے بچھونے سے لے کر اہم ترین مسائلِ حیات اور امور و نظم مملکت سب اس اخلاق کے ضمن میں آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا حقیقی مقصد اور غایتِ اُولیٰ مکارمِ اخلاق کی تکمیل قرار دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو "خُلقِ عظیم" کے منصب پر فائز فرمایا ہے۔ اگر اخلاق کا دائرہ اثر اور احاطۂ کار محدود ہوتا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے اپنی بعثت کا مدّعا و مقصود نہ بتلاتے۔ ظاہر ہے آپ کی نبوّت محض اصلاحِ معاشرت کے لئے نہیں بلکہ تشکیلِ تہذیب اور تعمیرِ تمدّن کی ذمہ دار بھی ہے۔ آپ صرف انفرادی معاملات (اور وہ بھی عام سطح کے) کو سُدھارنے کے لئے مبعوث نہیں کئے گئے بلکہ تمام اجتماعی معاملات کا سنوارنا بھی آپ کے فرائض میں شامل تھا۔ رسالتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام ایک تحریک ہے۔ ایک انقلاب ہے، جو آفاقی بھی ہے اور عالمگیر بھی، ابدی بھی ہے اور مکمل بھی، اور زندگی کے ہر پہلو پر محیط اور حیاتِ اجتماعی کے تمام شعبوں کے لئے کافی ہے۔ اس لحاظ سے آپ کا "متمّم اخلاق" بن کر آنا گویا انسانی زندگی کے ایک ایک جزو کی اصلاح کا ذمہ دار بن کر تشریف لانا ہے نہ کہ کسی پہلو کی معمولی اصلاح و تربیت کے لئے۔ یہ جو مشہور ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کے

اخلاق کا آئینہ بناؤ تو اس کا مطلب واضح ہے کہ اللہ کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ دو۔ یعنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اللہ کی مرضی اور خواہش سے ہم آہنگ بنا دو۔ اور اللہ کی مرضی کا حیطۂ اقتدار محض خوش کلامی اور خندہ جبینی تک محدود نہیں بلکہ اس کی مرضی تو انسان کی پیدائش سے اس کی موت تک وسیع ہے اور جملہ اُمور و معاملات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے ۔

مستند اور مشہور روایت ہے کہ جب سیّدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ فاضلہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ کا جواب یہی تھا: "کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْاٰنَ" یعنی اخلاقِ نبویؐ قرآن مجید کی عملی اور مکمل تصویر و تفسیر ہیں۔ گویا آپ کے اخلاقِ عالیہ مجسّم قرآن ہیں۔ یہ بات چنداں محتاجِ وضاحت نہیں کہ قرآن مکمل ضابطۂ حیات اور انسانی زندگی کا بہترین منشور ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جسے قرآن مجید نے نظر انداز کر دیا ہو اور اسے اپنی ہدایات سے محروم رکھا ہو۔ خورد و نوش، لباس و رہائش، گھر اور خاندان کے حقوق، پڑوسیوں اور رشتہ داروں سے حسنِ سلوک، فرد کی اہمیت اور اجتماع کی ضرورت، معیشت اور اقتصادیات، قوانینِ صلح و جنگ، سیاستِ مدن، تعمیر و ترقّی کے اسالیب، زوال و انحطاط کی وجوہات، تاریخ اقوام، عبادت و اطاعت، بندے اور خدا کا تعلّق، انسانوں کے باہمی روابط، حکومت کی ذمّہ داریاں، ہر ایک کا واضح اور مکمل بیان قرآن مجید میں ہے۔ قرآن جامع دستورِ حیات ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ عالیہ مجسّم قرآن ہیں تو یہ دونوں اس امر کی روشن دلیل ہیں کہ اخلاق درحقیقت انسان کی پوری حرکات و سکنات کا ایک ریکارڈ ہے، اور کوئی سا حصّہ اس سے باہر نہیں۔ یوں کہہ لیجئے کہ وہ شخص با اخلاق اور اخلاقِ فاضلہ کا حامل ہے، جس کی پوری زندگی قرآنی احکام و قوانین کے مطابق بسر ہو رہی ہے۔

اِس وضاحت اور تفصیل سے یہ بات سامنے آئی کہ ہمارے ہاں کے اخلاق کا مروجہ مفہوم فی الحقیقت غلط فہمی کی پیداوار ہے ورنہ اخلاق کا دائرہ پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ اب ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ عالیہ کا جائزہ لیتے ہیں کہ آپؐ نے زندگی کے ہر معاملے میں کس طرح "حُسنِ خُلق" کا مظاہرہ فرمایا اور آپ کی سیرت کے ایک ایک

درخشندہ و تابندہ واقعہ نے کس طرح آپ کے معلّم اخلاق ہونے کا بہترین ثبوت فراہم کیا ——— !!

استقلال : کسی بھی شخصیت کی خوبیوں کے بیان کے وقت جس خوبی کا سرفہرست ہونا لازمی ہے، وہ استقلال اور استقامت ہے۔ اس سے شخصیت کے مزاج، افتادِ طبع اور زندگی کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص کسی بات میں سنجیدہ، کسی امر میں یکسو اور کسی مسئلہ میں ٹھوس رائے نہیں رکھتا تو اس کی دوسری خوبیوں کے اظہار کی نوبت بھی نہ آسکے گی۔ کوئی شخص اگر ایسے درخت کی مانند ہے جو دیکھنے میں تو قدآور ہے، لیکن ہوا اُسے کبھی دائیں اور کبھی بائیں ہلاتی رہتی ہے تو اس سے کسی عظمت کی توقع بے سود ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسان کی مستقل مزاجی پرکھ لی جائے، ایسے افراد میں تو اس خوبی کا پایا جانا بس لازمی ہے، جو اصلاحِ احوال کی اجتماعی کوششوں کا دعویٰ کرتے ہیں اور اُن کا پروگرام پورے معاشرے پر محیط ہو۔ کیونکہ ایسے لوگوں سے سینکڑوں، ہزاروں لوگوں کی سیرتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ آئیے! ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ خوبی کس درجہ موجود تھی؟ یوں تو سیرت کی کتابوں میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے آپ کے عزم و استقلال کا ثبوت ملتا ہے۔ اختصار کے پیشِ نظر صرف ایک واقعہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ یہ واقعہ اس دور سے متعلق ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخالفتوں کا سامنا کر رہے تھے۔ ایک طرف تحریک کا ابتدائی دور اور دوسری جانب بے سروسامانی، اس پر چہار طرفہ مخالفت نے مشکلات کو دوچند کر دیا تھا۔ مخالفین کی طرف سے استہزاء، تمسخر، دشنام طرازی، افتراء پردازی، اوچھے حربے، جسمانی اذیت، ذہنی کوفت اور آپ کے رفقاء کے ساتھ متشددانہ بلکہ بہیمانہ سلوک غرضیکہ ہر وہ ستم جو ایجاد ہو چکا تھا، آپ اور آپ کے رفقاء پر آزمایا جا رہا تھا۔ یوں کہئے کہ کفارِ مکّہ خود "مُوجدِ ہر ستم" تھے۔ آپ کو جان سے ہلاک کر ڈالنے کے منصوبے جلاوطن کرنے کی سازشیں، سوشل بائیکاٹ کی دھمکیاں اور اس نوع کے دیگر حربے برابر آزمائے جا رہے تھے۔ لیکن اللہ کا ایک مخلص اور فرمانبردار بندہ اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ استقلال اور استقامت کا ایک نئی اور منفرد باب رقم کر رہا

تھا۔ اس جاں گسل کش مکش اور حوصلہ شکن حالات میں کفارِ مکہ نے مل کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مادی اعتبار سے محافظ و معاون جناب ابو طالب سے ملاقات کی اور اپنی تشویش کا اظہار کیا اور ساتھ ہی ساتھ ایسے لہجے میں گفتگو کی جس سے ابو طالب بھی سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ وہی شخص جو روزِ اوّل سے آپ کا ہر حال میں ساتھ دے رہا تھا، بوجھل قدموں اور اندیشوں سے معمور ذہن کے ساتھ ایک منصوبہ اور تجویز لے کر اپنے اولوالعزم بھتیجے اور نبی کے پاس آیا، اپنی مشکلات اور مجبوریوں کو تفصیل سے سامنے رکھا، کفار کے اجتماع اور ملاقات کا حوالہ دیا، پورے خاندان میں پھوٹ پڑنے کے نقصانات اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی سنگینی کا احساس دلایا اور آخر میں کہا: "بھتیجے! میرے ناتوان کندھوں پر اتنا بوجھ ڈالو جسے میں سہار سکوں"۔ اس نازک مرحلے پر جہاں ایک تنکے کی مدد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوہِ گراں کے برابر تھی۔ آپ نے پورے عزم و استقلال کے ساتھ ان حالات کے سامنے سپر انداز ہونے سے انکار کر دیا اور اپنے شفیق چچا سے یوں مخاطب ہوئے: چچا جان! میں آپ کے مخلصانہ تعاون، بزرگانہ شفقت، ہر طرح کی خبر گیری اور نگرانی پر بے حد شکر گذار ہوں لیکن جہاں تک اس تحریک کے سلسلے میں مفاہمت یا پسپائی کا تعلق ہے تو آپ مجھے معذور سمجھئے اور پورے جذباتِ سپاس و تشکر کے ساتھ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ: "یہ لوگ اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند رکھ دیں پھر بھی میں اپنے کام سے باز نہ آؤں گا۔ یا تو اللہ تعالیٰ مجھے اس میں کامیابی سے نوازے گا یا میں اس راہ میں کام آجاؤں گا"۔ یہ سننا تھا کہ جناب ابو طالب کی رگوں میں جوانوں کا سا عزم پیدا ہوا اور مضبوط لہجے میں کہا: "بھتیجے! اب جو چاہو کرو، اس راہ میں جو بھی روڑا بنا، اُسے ٹھوکر سے ہٹا دوں گا!"

توکل و اعتماد: توکل و اعتماد دوسرا وصف ہے جس کے فقدان کی صورت میں انسان کی اخلاقی و اجتماعی زندگی ناقص اور نامکمل نظر آتی ہے۔ یہ وہ داغ ہے جو دیکھنے والے کو دور سے نظر آجاتا ہے۔ جس ذات میں اللہ پر اعتماد اور توکل کا وصف نہیں وہ ذات جھک بھی سکتی ہے اور بک بھی۔ مگر توکل کے ہوتے ہوئے ایک انسان فقر میں میری کرتا ہے، خطرات میں گھر کر بھی پُر امید رہتا ہے، موت کو دیکھ کر بھی نہیں گھبراتا

یہ صفت ایسی ہے جس سے ہر مسلمان کو متصف ہونا چاہئے، مگر "میرِ کارواں" میں تو اس کا پایا جانا ازبس ضروری ہے۔ اسلامی تحریک کا طرۂ امتیاز ہی اللہ پر توکّل اور اعتماد ہے۔ توکّل ہی کے ذریعے انسان بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرا جاتا ہے۔ اسی سے ذہنوں کے دھارے اور تاریخ کے رُخ موڑے جاتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ کسی مقام پر محوِ استراحت تھے، آپؐ کی تلوار درخت سے لٹک رہی تھی، جان کا دشمن اور برسوں کا متلاشی دعثور بن حارث آن پہنچا، اپنی ناگہانی کامیابی پر بے حد مسرور ہوا۔ آپؐ کو سویا دیکھ کر اور زیادہ مطمئن ہوا کہ وہ آسانی سے آپ کو شہید کر سکتا ہے، بہرحال تھا وہ عرب، سوتے میں شہید کرنا مردانگی کے خلاف سمجھا، بڑے حقارت آمیز لہجے میں آپ کو نیند سے بیدار کیا، آپؐ کی لٹکتی تلوار پہلے ہی اپنے قبضے میں لے لی تھی، حضورؐ کی آنکھ کھلی، یہ منظر دیکھا مگر گھبرائے ذرہ برابر نہیں، بڑے اطمینان سے پوچھا کیا چاہتے ہو، دعثور نے بڑی رعونت اور درشتی سے پوچھا "اب میری تلوار سے تمھیں کون بچا سکتا ہے؟" — اس سوال پر مقابل کے ہوش و حواس کا خطا ہونا معمولی بات ہے۔ مگر آپؐ نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں فرمایا: "میرا اللہ!" — یہ سنتے ہی تلوار پر دعثور کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور خوف اور ہیبت سے تلوار ہاتھ سے گر گئی، کپکپی طاری ہو گئی، وہی سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دُہرایا۔ جواب میں سناٹا اور گمبھیر خاموشی، آپ نے روائتی تحمل اور مہربانی سے کام لیا اور فرمایا: "جا میں نے تجھے اللہ کے لئے معاف کیا!" — یہ فرمانا تھا کہ دعثور کے منہ سے بے اختیار کلمۂ شہادت نکلا اور دیکھتے دیکھتے آنکھوں جان لینے کا ارادہ لے کر آنے والا دل و دماغ دے بیٹھا۔ یہ سب کچھ کیوں کر ہوا؟ یہ محض اللہ پر اعتماد کا نتیجہ اور اس پر توکّل کا کرشمہ تھا۔

<u>عفو و درگزر</u>: سختی جو جبر و استبداد کی بناء پر ہو ایک قبیح امر ہے۔ نرمی جو کمزوری کی وجہ سے ہو قابلِ فخر بات نہیں۔ قانون کے دائرے میں سختی اور اختیار کے باوجود نرمی اخلاقی فضائل میں سے ہیں۔ عفو و درگزر کا مفہوم یہی ہے کہ بدلہ و انتقام کی پوری قدرت کے باوجود لوگوں کی غلطیوں سے صرفِ نظر کیا جائے۔ اخلاق کے اجزائے ترکیبی میں عفو و درگزر ایک اہم جزو ہے، اس کے بغیر تیار کیا ہوا ڈھانچہ یکسر ناقص ہے۔

یوں تو ہر حال میں عفو و درگزر ایک مستحسن امر ہے، لیکن اس کی ضرورت و اہمیت وہاں دوچند ہو جاتی ہے جہاں اپنی ذات پر زیادتی ہوتی ہو اور درگزر سے کام لیا جائے، اسی کا نام مروّت ہے ؂

آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت کا مطالعہ اور آپؐ کی پاکیزہ زندگی کا جائزہ لیتے وقت جابجا ہمیں ایسے واقعات نظر آتے ہیں کہ بارہا آپؐ نے اپنے جانی دشمنوں کو نہ صرف معاف کیا بلکہ انہیں نوازش و کرم سے سرفراز بھی فرمایا، اور بکثرت ایسے لوگ ملتے ہیں جو آپؐ کی عنایت اور مہربانی کو دیکھ کر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے ہیں۔ ہمیں ایسے دشمن بھی آپؐ کی نوازش و عنایت سے بہرہ ور ہوتے دکھائی دیتے ہیں، جن کا جرم اس قدر سنگین تھا کہ بڑی اور کڑی سزا بھی اس کا ازالہ نہ کر سکتی تھی۔ مگر آپؐ نے ہمیشہ زیادتی کرنے والوں سے درگزر فرمایا، دکھ دینے والوں کو دعائیں دیں، ایذا پہنچانے والوں سے بدلہ نہ لیا، بلکہ اُلٹا اُن سے احسان و مروّت کا سلوک فرمایا۔ ؂

ہُبار بن الاسود وہ شخص ہے جس نے پورا پورا زور اسلامی تحریک کو دبانے اور اس کے کارکنوں کو ستانے میں صرف کیا، اور کوئی ایسا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا جس سے آپؐ اور آپؐ کے فدائیوں کے لئے اذیت رسانی ممکن ہو، اور یہی وہ شخص ہے جس نے آپؐ کی صاحبزادی سیّدہ زینب کو برچھی ماری جس کے نتیجے میں آپ کا حمل ضائع ہو گیا۔ اُس مردود کی یہ حرکت آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو انتقام پر آمادہ کر سکتی تھی مگر فتح مکّہ کے دن جب مجرم آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے پیش کئے گئے تو مجرموں کی قطار میں ہُبار بن الاسود بھی سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ اپنے لئے اپنے جرم کی سنگینی کی سخت سزا تجویز کر چکا تھا، لیکن رحمتِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بڑے دل سے اس کے جرم کو معاف فرمایا بلکہ اُس سے مہربانی کا سلوک فرمایا ؂

کعب بن زُبیر عرب کا مشہور شاعر، اور فصیح و بلیغ ادیب تھا جس نے اپنی شاعری کا اکثر حصّہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف استعمال کیا۔ اس نے اپنی شاعری کو باقاعدہ محاذ کی شکل دی اور اسے مسلسل اسلام کے خلاف کھولے رکھا، یہ بھی فتح مکّہ کے موقعہ پر گرفتار کر کے لایا گیا۔ اس کے لئے جتنی بھی کڑی سزا تجویز کی جاتی بالکل

مناسب اور مطابقِ قانون تھی - مگر عفو و درگزر کے پیکر نبیؐ نے نہ صرف سزا معاف کی بلکہ اپنی عنایتِ خاص سے اُسے ایک چادر مرحمت فرمائی - سُہیل بن عمرو عرب کا مانا ہوا خطیب، شعلہ نوا مقرر، زبان آور شاعر تھا - اُس نے محسنِ انسانیتؐ کے خلاف ہجو کی انتہا کر دی، غلیظ تلمیحات، گندے استعارات، اور مکروہ اشارات سے آپؐ کی توہین کی، پورا زورِ خطابت اسلام کے خلاف صرف کیا، اور اپنی گز بھر کی زبان، بے پناہ زورِ بیان اور تمام علمی و ادبی توانائی کو اسلام کی مخالفت اور پیغمبرِ اسلامؐ کی مذمت میں صرف کیا - غزوۂ بدر میں جنگی قیدی بن کر آیا، اس نے جس اسلام اور پیغمبرِ اسلام دشمنی کا ثبوت دیا تھا - اسکی بناء پر حضرت عمرؓ کی رائے مبنی بر انصاف تھی کہ اس کے سامنے کے دانت اُکھڑوا دیئے جائیں - اِس سزا میں کسی قسم کی زیادتی اور تعصب نہ تھا، مگر یہ بات رحمۃ للعالمین کیسے گوارا کر لیتے - آپؐ نے فرمایا عمرؓ ! تمھارا جوش و خروش برحق، تمھاری غیرت و حمیت مسلّم، مگر مجھے خوف آتا ہے کہ اگر میں نے اس کی شکل مسخ کی تو شاید خدا میرے ساتھ یہی معاملہ نہ کر دے اور آپؐ نے اس کا قصور معاف فرما دیا - سیرت میں ایک سے ایک بڑھ کر واقعات ہیں جو منہ بولتا ثبوت ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ عالیہ کے، جس سے معلوم ہوتا ہے عفو و درگزر کا وصف آپ میں بدرجۂ کمال موجود تھا ؛

عالی ظرفی : جو شخص جتنا باکمال ہوگا اتنا ہی عالی ظرف ہوگا، اس کی سوچ کا زاویہ وسیع، نگاہ بلند اور دل فراخ ہوگا، معمولی باتوں پہ خفا ہونا اور وقتی فائدوں سے زائد از ضرورت دلچسپی اُس کے مزاج کے خلاف ہوتی ہے - عالی ظرف انسان اختیار ملنے پر اترا تا نہیں اور زبوں حالی میں گھبراتا نہیں، ہر حال میں اس کی طبیعت میں اعتدال اور توازن ہوتا ہے، نہ وہ وقتی کامیابیوں کا دلدادہ اور نہ وقتی ناکامیوں سے خوفزدہ ہوتا ہے - حالات کا مدّ و جزر اس کے دل و دماغ کے سمندر میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں کرتا، ماحول کی شکست و ریخت اُس کے نظامِ قلب و روح میں بگاڑ پیدا نہیں کرتی وہ ہمیشہ ہر حال میں بلند نگہی اور کشادہ قلبی کا مظاہرہ کرتا ہے - اخلاقِ عالیہ کی فہرست مرتب کرتے وقت اگر اس وصف کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ فہرست ہمیشہ کے لئے نامکمل رہے گی - جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ پہلو شخصیت ہمارے سامنے آتی

ہے، تو وہاں آپ کی سیرت میں عالی ظرفی کا عنصر واضح طور پر نظر آتا ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ آپ نے جب مصائب و آلام کی زندگی گزاری تو وہ زندگی انتہائی عسرت کی زندگی تھی اور جب آپ کو اقتدار ملا تو انتہا کی شان و شوکت حاصل ہوئی، مگر کیا مجال کہیں بھی آپ نے عالی ظرفی کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑا ہو۔ مکّے کی دکھ بھری زندگی اور مدینے کی حکومت و اقتدار کی زندگی دونوں ہمارے سامنے ہیں — زندگی کے یہ دونوں پہلو سامنے رکھ کر ان دو واقعات پر غور فرمائیے!

تبلیغ اسلام جاری ہے پوری محنت اور لگن سے، کاروان بن تو رہا ہے لیکن بڑھے آہستگی سے، ابھی بمشکل انگلیوں پر شمار ہونے والے صاحبی میسّر آسکے ہیں۔ بھری بستی میں یہ تنہائی کچھ کم حوصلہ شکن نہیں، لیکن جس کا پیغام آفاقی، دعوت عالمگیر، پروگرام وسیع الاطراف اور ذہن عرش کی بلندیوں کو چھو رہا ہو، وہ جلد حوصلہ ہارنے والا نہیں ہوتا، پروگرام کے مطابق طائف تشریف لے جاتے ہیں کیونکہ مکّہ میں اب کوئی ایسا چپّہ خالی نہ تھا جہاں ظلم کی صلیب نہ گاڑ دی گئی ہو۔ اہل طائف کو اپنے پیغام سے آگاہ کرتے ہیں، اللہ پر ایمان لانے کے فوائد، اس کے انکار پر عذاب و وعید بیان فرماتے ہیں۔ لیکن اہل طائف نے اس معزز مہمان کی تواضع سب و شتم اور پتھروں سے کی۔ پنڈلیاں لہولہان ہیں، خون بہہ بہہ کر جوتے میں جم گیا ہے، زخموں کے باعث قدم اٹھانے دشوار ہو گئے ہیں، سوائے اللہ کے کوئی معاون و مونس نہیں۔ شہر کے لفنگے، لونڈے اور بازاری چھوکرے آوازے کس رہے ہیں، بیٹھنے کا ارادہ کرتے ہیں مگر ہر جگہ سے اُٹھا دیتے ہیں۔ ٹھٹھہ، استہزاء اور مذاق اپنے عروج کو پہنچ گیا ہے، ایسے میں پہاڑوں کا فرشتہ یہ اجازت لینے آتا ہے کہ حکم ہو تو دونوں پہاڑ ایک دوسرے کے قریب کر دوں جس سے اہل طائف پس کر رہ جائیں، یا کوئی بددعا کیجیے کہ قبولیت منتظر ہے۔ اس عالم میں دُنیا کے سب سے بڑے عالی ظرف انسان یوں گویا ہوتے ہیں:

انّی لم ابعث لعّانا ولکن	"میں بددعا کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔
بعثت رحمۃً۔ اللّٰھم اھد	میں تو سراپا رحمت ہوں، خدایا اس
ھٰذا القوم فانّھم لا یعلمون	قوم کے شعور کی آنکھیں کھول دے
	یہ بیچارے میری بات سمجھتے نہیں!"

اللہ اکبر! اس عالی ظرفی کا شاید ہی کسی نے مظاہرہ کیا ہو۔

اب مدنی زندگی سے متعلق ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے:

فتح مکّہ کا دن ہے، آج مکّے کی چابیاں اور اس کا اقتدار اُن کے ہاتھوں میں ہے جن کو بڑی بے رحمی سے نکالا گیا تھا۔ وہ لوگ جن کا یہاں جینا دوبھر کر دیا گیا تھا۔ آج فاتح بن کر داخل ہو رہے ہیں، جن کو یہاں چین سے سانس لینے کی اجازت نہیں تھی آج وہ مختار و مقتدر بن کر آئے ہیں — مغلوبوں کو جب کبھی غلبہ حاصل ہوتا ہے، تو وہ جو کچھ کرتے ہیں یہ کوئی پوشیدہ راز نہیں، دو آنے اوپر بدلہ لیتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں آتشِ انتقام بجھاتے ہیں، یہ ایک عمومی رواج ہے لیکن آج اِن فاتحین کی زمامِ کار اُس کے ہاتھ میں ہے جس کی عالی ظرفی کے ڈنکے چار دانگِ عالم میں بج رہے ہیں۔ ستانے والے اپنے کرتوتوں کو یاد رکھے ہوئے ہیں مگر جن پہ گزری ہے وہ گویا ظلم و ستم کی کہانی بھول گئے۔ وہ لوگ جن کی گردنیں ہمیشہ اکڑی رہتی تھیں، جو اس طرح چلتے تھے گویا ابھی زمین پھاڑ دیں گے، سر کو یوں اونچا کئے رکھتے جیسے آسمان سے گھس رہا ہو، رعونت اس قدر بے محابا کہ شیطان شرما جاتا تھا ظلم میں اس قدر ماہر اور ظلم کے طریقوں میں اس قدر مشّاق کہ خود ظلم پسیج جاتا تھا۔ سینے میں دل نہیں، بڑے بڑے پتھر رکھے ہوئے تھے۔ آج وہی متکبّر، جبّار، ظالم اور جفا کار، مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں اور سزا کے منتظر ہیں ایسے میں رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی آواز گونجتی ہے۔ بتاؤ میں کون ہوں؟ ملی جُلی آوازیں فضا میں اُبھرتی ہیں، جن میں تسلیم و اعتراف کی کھنک اور شکستِ پندار کی جھجک صاف طور پہ نمایاں ہے: "آپ مہربان بھائی اور مہربان بھائی کے بیٹے ہیں"۔ مجسّمِ رحمت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "میں تمھارے ساتھ وہی سلوک کرتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ جاؤ آج تم سب آزاد ہو، تم پر کوئی ملامت نہیں"۔ اسے کہتے ہیں عالی ظرفی اور یہ ہے اس کا پاکیزہ اور بلند معیار جس پہ مادرِ گیتی کا کوئی فرزند شاذ ہی پورا اُتر سکے۔ کروڑوں رحمتیں اس پہ جو دُکھ میں گھبرایا نہیں اور کروڑوں سلام اُس پہ جو سُکھ میں اترایا نہیں۔

<u>تواضع و انکساری</u>: ایک مسلّمہ حقیقت اور اٹل ضابطے کو شیخ سعدی رحمۃ اللہ

علیہ نے کس سادگی اور بلاغت سے بیان کیا ہے ؎

تواضع زگردن فرازان نکوست ٭ گدا گر تواضع کند خوئے اوست

انکساری ہمیشہ عالیجاہ اور صاحبِ مرتبہ لوگوں کو اچھی لگتی ہے، ورنہ گدا اگر تواضع کرے بھی تو کیا ہوا یہ تو اس کی عادت ہے۔ علمائے اخلاق نے اخلاق کے ضمن میں تواضع اور انکساری کو نمایاں جگہ دی ہے۔ اس وصف سے عاری انسان ایک زشت خُو اور درشت رُو کے طور پر متعارف ہوتا ہے، اور ایسا تعارف کسی کیلئے باعثِ عزت نہیں ہوتا لیکن شرط وہی ہے کہ انسان اونچے سے اونچے منصب پر پہنچ کر بھی تکبّر اور غرور کو قریب نہ آنے دے اور تواضع اور انکساری کو اپنی طبیعتِ ثانیہ بنائے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق کے اعلیٰ منصب پر فائز ہیں، تو ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ آپ نے تواضع اور انکساری کی عادت کو اس وقت بھی برقرار رکھا جب آپ کی حکومت شمال میں اُردن، جنوب میں یمن، مشرق میں خلیج فارس اور مغرب میں بحیرۂ احمر تک پھیل چکی تھی۔ تاریخ و سیرت کے مطالعہ سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ آپ نے نہ صرف تواضع کے معمول کو برقرار رکھا بلکہ اُسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا اور یوں لگتا ہے کہ آپ کا خمیر درحقیقت تواضع ہی سے اٹھایا گیا اور انکساری کے سانچے میں ڈھالا گیا ؎

سیرتِ طیبہ کا ایک واقعہ پیشِ خدمت ہے :

آپ مسجدِ نبویؐ میں صحابہؓ کے جھرمٹ میں تشریف فرما ہیں، منظر کچھ ایسا ہے جیسے تاروں کی بزم میں چودھویں کا چاند صدر نشیں ہو، سربرآوردہ افراد، ممتاز حکّام و خدّام کا جمگھٹا، قومی اور بین الاقوامی مسائل، دینی اور سیاسی باتیں، بڑے بڑوں کے پیغامات زیرِ غور، مستقبل کے عظیم الشان منصوبے زیرِ تجویز، ماحول میں حد درجہ سادگی کے باوصف ایک عجیب سا رعب اور وقار تھا، دُور سے آنے والا ایک بدوی سمٹا سہما آپ سے شرفِ نیاز حاصل کرتا ہے۔ آپ پوری شفقت اور مہربانی سے اُسے ملتے ہیں، اُس سے مدّعا پوچھتے ہیں تو ماحول کی اثر انگیزی کے باعث اس کے ہونٹ پھڑپھڑائے، زبان ہکلائی اور الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ آپ نے اُس کی یہ کیفیت دیکھی تو بڑے دھیمے اور میٹھے لہجے میں اس

سے مخاطب ہوئے۔ اس جگہ اگر کوئی اور فرماں روا ہوتا تو یقیناً اپنے دل میں خوشی محسوس کرتا، تکبّر سے اُس کا نفس فربہی حاصل کرتا اور اس کا یہ جھوٹا پندار مزید مستحکم ہوتا کہ میرا رعب خوب اور دبدبہ شاندار ہے کہ رعایا بات کرتے کانپتی اور پیش ہوتے ڈرتی ہے، مگر جو عظمتوں کے آخری کنارے چھو رہا ہو، سکندری کرّوفر جس کے قدموں میں پامال ہو رہا ہو اور دارائی شان و شکوہ جس کا باجگزار ہو، وہ ان معمولی باتوں سے کب متأثر ہوتا ہے، اُسے جھوٹے رعب اور کھوکھلے دبدبے سے کیا واسطہ؟ وہ تو عظمتوں کے چراغ دل کے نہاں خانوں میں روشن کرنے کا قائل ہے۔ آپؐ نے شفقت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا ارے میاں! بات کرتے جھجکتے کس لئے ہو، مَیں تو تمہاری طرح کا انسان ہوں اور مَیں وہ ہوں، جس کی ماں خشک گوشت کے ٹکڑے کھا کر پیٹ بھرتی تھی اور کبھی نانِ جویں کے روکھے ٹکڑے پانی میں بھگو کر نوشِ جاں کرتی تھی اور اسی حالت میں دنیا سے گزر گئی۔ اس مقدّس سلسلے کی دوسری سنہری کڑی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نہایت ہی متواضع انسان اُس وقت اپنے آپ پر کنٹرول نہیں کر سکتا اور بے اختیار طبیعت ترفّع اور تکبّر کی جانب مائل ہو جاتی ہے جب غیب سے ایسی عظمت کا سامان پیدا ہو جائے جس کے بارے میں اُس نے کبھی سوچا تک نہ ہو، یہ ایک فطری بات ہے۔ مگر اس آزمائش میں بھی آمنہ کا لال سرخرو ہو کر نکلتا ہے۔ آپؐ ایک لاکھ سے متجاوز جاں نثار سپاہیوں اور خادموں کے جلو میں شاندار فتح اور عظیم الشّان کامیابی سے ہمکنار ہو کر مکّہ میں داخل ہو رہے ہیں، دائیں بائیں آگے پیچھے عقیدت مندوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر، جذبات ہیں کہ اُمڈے پڑتے ہیں، محبّت اور چاہت ہے کہ اُبلی پڑتی ہے۔ عقیدت و محبّت کا یہ نظارہ عظمت و جلالت کی یہ کیفیت، مگر یہاں بھی آپ پیکرِ تواضع نظر آ رہے ہیں۔ آپ جس اونٹنی پر سوار ہیں، اُس پر معمولی کجاوہ رکھا ہے اور آپ کا سر تواضع اور انکساری سے اِس قدر جھکا ہوا ہے کہ پیشانی کجاوے سے ٹکرا رہی ہے۔ ابوسفیان یہ منظر دیکھ کر حضرت عباسؓ سے مخاطب ہوتا ہے، عباس! اپنے بھتیجے کی عظمت و جلالت دیکھو آج تو وہ بادشاہ نظر آ رہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں "ابوسفیان آنکھیں کھول کر دیکھو بادشاہوں

کی گردنیں اس طرح خمیدہ نہیں ہوتیں' تواضع اور انکساری کا یہ منظر چشم فلک نے کبھی کبھار ہی دیکھا ہوگا اور شائد اس سے پہلے نہ دیکھا ہو!

مدح وستائش سے گریز: جب بھی اخلاق کا موضوع زیر بحث آئے گا اور اخلاق کے حاملین کا ذکر چھڑے گا تو اُن کے جملہ اوصاف میں سے اس وصف کا بیان ضروری سمجھا جائے گا کہ صاحب کمال لوگ اپنے نفس کی تسکین کے لئے اپنی مدح و ستائش سے ہمیشہ گریزاں رہے، اپنے جائز کمالات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے نہ خود عادی تھے اور نہ ہی دوسروں کو یہ اجازت دینے کے لئے تیار تھے کہ وہ عقیدت مندی کے جوش میں حقیقت کو افسانے کا رُوپ دے کر اُن کی نشر و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، ایسے ارباب فضل اور اصحاب کمال نہ تو خوشامد پسند کرتے ہیں اور نہ ہی تعریف میں افراط و تفریط کو اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حقیقت پسند لوگ ہمیشہ ہر بات کو اس کے حقیقی خدّ و خال میں دیکھنا چاہتے ہیں، وہ اپنے قدو قامت کو ایڑیاں اونچی کر کے نہیں بڑھاتے اور نہ کسی کھوکھلی چیز بیسا کھیوں کے سہارے قائم کرنے کے عادی ہوتے ہیں، وہ اپنی ایسی شہرت سے بھی نفور رہتے ہیں جس میں واقعیت کی نسبت رنگ آمیزی زیادہ ہو بلکہ وہ تو جائز تعریف و تحسین کو بھی اپنے سامنے بیان کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے ۔

اس مقام پر بھی حاملین و معلّمین اخلاق کی صف میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سب سے نمایاں اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ آپؐ کی سیرت کا مطالعہ کریں تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ آپ نے ہمیشہ اپنی تعریف کو پسند نہیں فرمایا، کجا کہ اُس میں رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی در آئے۔ اگر کسی نے غیر محتاط انداز میں آپ کے کمالات بیان کرنا چاہے تو آپ نے کھلے لفظوں میں اُسے ٹوکا اور اس کی اصلاح کر دی۔ اگر کوئی بڑے احترام اور حقیقت پسندانہ لہجے میں آپ کی توصیف و تحسین شروع کرتا تو اُسے آپ حکیمانہ انداز میں اس سے روک دیتے اور اس کی توجہ کسی دوسری جانب مبذول کرا دیتے۔ سیرت کی کتابیں گواہ ہیں، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صاحبزادے جناب ابراہیمؓ کا انتقال ہوا تو اتفاق سے اُس دن سورج کو گرہن لگا ہوا تھا۔ بعض لوگوں نے آپس میں چہ میگوئی شروع کر دی کہ دیکھو نبی کی عظمت اور رسولؐ کی

شان، کہ آپؐ کے غم میں سورج بھی شریک ہوگیا ہے، وہ بھی سوگ منا رہا ہے تبھی تو اُس کی روشنی ماند پڑ گئی۔ اسی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں کہ آپؐ کو اُن کا علم ہو گیا اِس اظہارِ عقیدت اور جوشِ محبت پر خوش ہونے کے بجائے آپ کو عقیدت اور محبت کا یہ انداز ناگوار گزرا اور فوراً لوگوں کو اکٹھا کر کے گردشِ لیل و نہار اور سورج اور چاند کے طلوع و غروب کے ضمن میں گفتگو فرمائی۔ آپ نے اس امر کو واضح فرمایا کہ سورج کا چمکنا اور اُسے گرہن لگنا یہ سب اللہ کے اختیار میں ہے اور اسی کی مرضی کے مطابق یہ سب کچھ ہوتا ہے، کسی کے پیدا ہونے اور مرنے سے نظامِ شمسی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، چاہے پیدا ہونے والا یا وفات پانے والا نبیؐ وقت کا قریبی عزیز اور بیٹا ہی کیوں نہ ہو — یہ ہے اخلاق کی وہ بلندی جو سیرتِ نبویؐ کا طرۂ امتیاز ہے۔ حالانکہ یہی وہ موقعہ ہے جب لوگوں کی ارادت مندی اور عقیدت کا بآسانی استحصال کیا جاتا اور اُن کے ذہن و قلب پر اپنی عظمت و بزرگی کا سکّہ بٹھایا جا سکتا تھا کیونکہ لوہا از خود گرم ہے صرف ضرب لگانا باقی ہے۔ مگر "صاحبِ خلقِ عظیم" ایسی باتوں سے بے نیاز ہوتا ہے، جو حقیقی معنوں میں تعریف کا مستحق ہو وہ ان مصنوعی طریقوں پر نگاہِ غلط ڈالنا پسند نہیں کرتا، چہ جائیکہ وہ انہیں اختیار کرے، بہر کیف آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سستی شہرت سے ہمیشہ گریزاں رہے، خدا نے خود ہی انہیں اتنی تعریف کا مستحق بنا دیا ہے کہ مزید تحسین کی آپ ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے ——— !!

تواضع اور انکساری کا یہ عالم ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے اظہارِ عقیدت کے طور پر آپ کو "اے ہمارے آقا، اے ہمارے آقا کے فرزند، اے ہم میں سب سے بہتر اے ہم میں سب سے بہتر کے فرزند!" کے مکرم و محترم الفاظ سے خطاب کیا، تو آپؐ اس پر چونکے اور فوراً اصلاح فرما دی اور فرمایا: "اے لوگو! پرہیز گاری اختیار کرو شیطان تمھیں گرا نہ دے، میں عبداللہ کا بیٹا "محمّد" ہوں، خدا کا "بندہ" اور اس کا "رسول" ہوں، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ تم مجھے اس سے بڑھاؤ!" — یہ ہے مدح و ستائش سے گریز کا بہترین نمونہ جو سیرتِ نبویؐ کا خاصّہ ہے اور "خلقِ عظیم" کی عمدہ مثال ہے ٭

عدل وانصاف : دنیا کے ہر نظام میں عدل وانصاف کو بطور ایک اہم اُصول کے جگہ دی گئی ہے اور برابر اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ عدل وانصاف بہر صورت قائم رکھا جائے، نہ اسے زائد از ضرورت رحم سے ملوّث کیا جائے اور نہ ہی بیجا ظلم سے آلودہ، عدل کی میزان ہر حال میں مستحکم رہے اور اُس کے دونوں پلڑے برابر رکھنے کی ممکن حد تک کوشش کی جائے، نہ تو اس کا کوئی پلڑا سفارش جھکا سکے اور نہ رشوت، عدل کا شکنجہ اس قدر مضبوط ہو کہ بڑے سے بڑا آدمی بھی وہاں لایا جائے تو بلا توقف اُسے اُس میں کس دیا جائے اور یہ معیار اتنا مکمل ہو کہ اپنی ذات بھی اس سے مستثنیٰ نہ رکھی جائے، اصول اور ضابطے کی حد تک تو انصاف اور عدل کی اہمیت ہر جگہ اور معاشرے میں مسلّم رہی ہے۔ مگر دیکھنے والی بات یہ ہے کہ آیا اُسے اُس سختی اور دیانتداری کے ساتھ قائم بھی رکھا گیا یا نہیں؟ دوسروں کے بارے میں مثبت اور منفی رائے ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم اُن سے سروکار نہیں رکھتے تاہم جب بات آتی ہے "معلّم مکارمِ اخلاق صلّی اللہ علیہ وسلّم" کی تو ایک نہیں بیسیوں شہادتیں اس کی میسّر آجاتی ہیں کہ فی الواقع آپ نے عدل وانصاف کے سلسلہ میں نہ صرف "اقامتِ میزان" کو ملحوظ رکھا بلکہ اُسے مزید مستحکم بنانے کی بھرپور کوشش فرمائی اور بشمول اپنی ذات کے کسی کو بھی یہ اجازت نہیں دی کہ وہ میزانِ عدل کو اپنے حق میں جھکا دے۔

تاریخ کا یہ متواتر، مشہور اور مستند واقعہ ہے۔ مخزومی قبیلے کی فاطمہ نامی عورت چوری کے جرم میں ماخوذ آپ کے پاس لائی گئی۔ قریش نے بھرپور کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح فاطمہ سزا سے بچ جائے، کیونکہ قریش کی ناک کا مسئلہ تھا اور جاہلی سوچ کے مطابق عدل وانصاف کی میزان میں وہ بڑوں کے لئے ڈنڈی مارنا جائز سمجھتے تھے۔ اور انہیں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے اس مزاج کے بارے میں علم نہ تھا جو وہ عدل وانصاف کے ضمن میں رکھتے تھے۔ چنانچہ قریش نے جناب اُسامہ بن زیدؓ کو بطورِ سفارش آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اُسامہؓ کو جو قرب آپؐ کے دربار میں حاصل تھا اور جس محبّت اور شفقت کا برتاؤ حضورؐ اُسامہؓ سے فرماتے تھے وہ ہر شخص پہ عیاں ہے، لیکن اس کے باوجود پیکرِ عدل اور مجسّمۂ اخلاق وانصاف رسولؐ نے اپنے

تعلّق خاطر اور اُسامہؓ کی محبوب اور گراں قدر شخصیت کو بالائے طاق رکھا اور فرمایا :-
"بنی اسرائیل اس لئے تباہ ہوئے کہ غربا پر حد جاری کرتے اور اُمراء سے درگزر کرتے تھے!" — مزید فرمایا: "اگر اس جرم میں میری بیٹی فاطمہؓ ماخوذ ہوتی تو میں اُس کے بھی ہاتھ کاٹنے میں قطعاً تامّل نہ کرتا!" — آپ مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے ہیں، لوگوں کا ہجوم ہے اور اُن میں بدویوں کی اکثریت ہے، تکلّف سے عاری اور بے حد سادہ ماحول میں دھکم پیل کا ہونا قدرتی بات ہے، ایسے میں ایک بدوی مُنہ کے بل آپ پر گر گیا، ہاتھ میں چھڑی تھی۔ آپ نے اُس چھڑی سے اُسے ہلکا سا ٹھوکا دیا۔ اتفاق سے چھڑی کا سرا اُس کے منہ پر لگا اور خراش آ گئی۔ آپ نے فوراً فرمایا: "مجھ سے بدلہ لے لو، میں حاضر ہوں" معاملہ یہیں ختم ہو جائے تو اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ قیامت میں مؤاخذہ ہو۔ ہمارے ماں باپ قربان اس رسولِ برحق پر جس نے عدل و انصاف کی لاج رکھی اور عدل و انصاف کے مفہوم سے پوری انسانیت کو آشنا کیا ؛

<u>ایثار</u>: اپنے جائز حق کا مطالبہ اور تحفّظ کسی بھی لحاظ سے مذموم نہیں اور نہ ہی اسے خود غرضی، ذات پرستی اور اقرباء نوازی کہا جا سکتا ہے کہ آخر اس حق کا مطالبہ یا حصول کیوں لائقِ تنقید ٹھہرے جو معاشرے اور مملکت نے از خود دیا ہے تاہم اخلاقِ فاضلہ کے بلند مناصب پر فائز افراد ہمیشہ ترک و ایثار سے کام لیتے ہیں یعنی دوسروں کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں اور اپنے لئے کم سے کم مراعات بلکہ بوقتِ ضرورت اپنی جائز ضروریات کم کر کے دوسروں کو آرام بہم پہنچاتے ہیں ؛

ہمیشہ وہی تحریک پروان چڑھتی اور وہی معاشرہ خوشگواریوں کا حامل ہوتا ہے جس کے کارکن اور افراد ایک دوسرے سے بڑھ کر ایثار کا مظاہرہ کریں اور قدم قدم پر اسی قسم کی یادگاریں قائم کرتے جائیں۔ فرزندانِ اسلام کا یہ خاصہ رہا ہے کہ وہ اپنے آپ پر ہمیشہ دوسروں کو ترجیح دیتے اور اپنے مفادات کو یکسر نظر انداز کر کے دوسروں کے حقوق و مفادات کا تحفّظ کرتے رہے۔ یہ سب کچھ کسی تصنّع یا تکلّف سے بے پروا ہو کر اور ایک سچے جذبے کی تحریک پر کیا گیا۔ یہ حال ان لوگوں کا ہے جو اچھے اخلاق کے حامل ہیں اور ممکن ہے اُن سے کوئی پہلو رہ بھی جاتا ہو۔ مگر اس عظیم و عزیز ہستی کے ترک و ایثار کا کیا عالم ہوگا جو نہ صرف خود "صاحبِ خلقِ عظیم" ہے بلکہ اخلاقِ کریمی کی تکمیل

اُس کا مقصدِ حیات ٹھہرا ہے۔ یوں تو آپ کی ساری زندگی ترک و ایثار کا مجسمہ اور زندگی کا ایک ایک گوشہ قربانی کا مرقع نظر آتا ہے۔ تاہم ایک واقعہ نقل کرنا یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا ؎

آپؐ ایک غزوہ سے فتح یاب واپس لوٹے ہیں، اموال و غنائم آپ کے سامنے ہیں، کچھ لونڈیاں بھی مالِ غنیمت میں آئی ہیں۔ آپ کا یہ اُصول تھا کہ مالِ غنیمت میں سے ضرورت مندوں کو سب سے پہلے سرفراز فرماتے۔ اگر کچھ بچ رہتا تو اسے بیت المال میں داخل فرما دیتے۔ آپ کی دخترِ نیک اختر سیّدہ فاطمہؓ حاضرِ خدمت ہوتی ہیں اور اپنی تنگ دستی، افلاس اور اس کے ساتھ ساتھ محنت اور مشقّت اور کام کی زیادتی کی تفصیل بیان کرتی ہیں اور ساتھ ہی سوال کرتی ہیں کہ اب کی بار آنے والی کنیزوں میں سے ایک دو مجھے دے دی جائیں تو کام کا بوجھ ایک حد تک ہلکا ہو جائے گا۔ آپ کو سیّدہ فاطمہؓ کی نزاکت کے باوصف اُن کی محنت کا پورا احساس تھا اور اکیلے ہی جھاڑو پھیرنا، کپڑے دھونا اور سینا، چکّی پیسنا، حسنینؓ کی تربیت و نگہداشت کرنا، آٹا گوندھنا پانی بھرنا، خاوند کی خدمت کرنا اور پھر رات کا اکثر حصّہ عبادتِ الٰہی میں بسر کرنا ان سب باتوں کا احساس تھا۔ مگر اس سب کے ہوتے ہوئے جو فیصلہ فرمایا وہ ایثار کی تاریخ میں منفرد فیصلہ ہے اور اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دینے کی زرّیں مثال ہے۔ فرمایا "جانِ پدر! کیا کروں؟ بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے ہیں اور وہ واقعی ضرورت مند ہیں!" سیّدہ بھی چونکہ آغوشِ نبوّت کی پروردہ تھیں، اس فیصلے کو بڑی خوشدلی سے سُنا اور خاموشی سے چل دیں۔ بدر کے یتیموں کی ضرورت کے احساس نے اپنے احساسِ مشقّت کو مٹا دیا ؎

حسنِ معاملہ: ایک مسلّمہ اُصول اور معیار بھی ہے اور حدیثِ رسولؐ بھی کہ کسی آدمی کے بارے میں اس وقت تک بھلی یا بُری رائے حتمی طور پر قائم نہ کرو جب تک اُس سے معاملہ کر کے نہ دیکھ لو۔ گویا حُسنِ معاملت دلیل ہے حُسنِ اخلاق کی، اور کسی کے اچھے اور بُرے ہونے کا فیصلہ معاملہ ہی سے ممکن ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ معاملہ وہ آئینہ ہے جس میں انسان اپنے حقیقی خدّ و خال کے ساتھ صاف طور پر نظر آجاتا ہے اور ہم اُس کے چہرے کے نکھار اور اس پر دھبوں اور جھرّیوں سے پوری طرح آگاہ ہو سکتے ہیں

اخلاقِ نبویؐ میں سے حسنِ خلق کا یہ شعبہ بھی اپنے طور پر کامل اور نہایت قابلِ رشک ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسنِ معاملہ، دیانتداری اور راستبازی کے جوہر نہ صرف بعد از بعثت کھلے۔ بلکہ ان کی چمک دمک سے ایک زمانہ پہلے ہی آشنا تھا۔ ابھی آپ خلعتِ نبوّت سے بظاہر سرفراز نہیں ہوئے تھے، اُس وقت بھی پورا معاشرہ آپؐ کو "الصّادق" اور "الامین" کے باوقار القاب سے یاد کرتا تھا۔ ایک پائی سے لے کر لاکھوں دراہم و دنانیر آپؐ کے ہاتھوں میں رہے، کبھی بطورِ امانت اور کبھی برائے تجارت، دونوں حالتوں میں صداقت و امانت اپنی انتہائی بلندیوں پہ رہی ؎

سائبؓ نامی عرب کے ایک تاجر تھے۔ ہجرت کے بعد انہیں خدا نے قبولِ اسلام کی نعمت سے نوازا۔ جب وہ قبولِ اسلام کے ارادے سے مدینہ منوّرہ آئے تو اہالیانِ مدینہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمدہ اخلاق کی اُن کے سامنے بیحد تعریف کی تو سائبؓ نے کہا: "مَیں اُن کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ ان پہ میرے ماں باپ فدا ہوں، وہ میرے کاروبار میں ساجھی تھے لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا"

اس ضمن میں ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمائیے: مدینہ منورہ کے باہر ایک قافلہ آکر ٹھہرا، اُن کے پاس ایک عمدہ نسل کا سرخ اُونٹ تھا۔ آپؐ نے اسے دیکھا تو بیحد پسند فرمایا اور خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا، وہ لوگ اس پر راضی ہوئے آپ نے بغیر حیل وحجت کے انہیں ان کی منہ مانگی قیمت دینے کا وعدہ فرمالیا اور مہار پکڑ کر شہر کو چل دیئے۔ آپ کے چلے جانے کے بعد قافلہ والوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ ہم نے کس حماقت کا ارتکاب کیا ہے کہ اجنبی کے ہاتھ اپنا اونٹ دے دیا ہے اور بغیر قیمت وصول کئے اسے لے جانے کی اجازت دے دی۔ اُس قافلے میں ایک زیرک اور ذہین عورت بھی تھی اور بعض روایات میں اُسے قافلہ کی سربراہ لکھا گیا ہے۔ اس نے یہ بات سنی تو کہا "ہم نے آج تک اس قدر روشن چہرہ نہیں دیکھا اور مجھے کامل امید ہے کہ یہ روشن چہرے والا ہم سے کبھی دغا نہیں کرے گا"۔ اس عورت کے حسنِ اعتقاد میں اُس وقت اور نکھار آگیا اور قافلہ والوں کے اندیشے یکسر دم توڑ گئے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اونٹ کی پوری قیمت بھی روانہ

فرمائی اور ساتھ ہی قافلے والوں کو کھانا بھی بھجوا دیا۔

الغرض اخلاقِ نبوی کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ زندگی کا کوئی انفرادی اور اجتماعی گوشہ باقی نہیں رہتا جس میں آپ کے اعلیٰ اخلاق کی جلوہ گری نہ ہو۔ ابھی بیان کرنے کو تو کافی چیزیں رہ گئی ہیں جن کی قدر و قیمت بار بار دہرانے سے کم نہیں ہوتی پھر بھی طوالت مقصد نہیں ورنہ مداومت عمل، جُود و سخا، مہمان نوازی، عدمِ تشدّد، مساوات، شرم و حیاء، شجاعت، سادگی، بے تکلفی، امارت پسندی سے اجتناب، لطفِ طبع، رحمت و محبتِ عام، غیروں سے برتاؤ، خوش رُوئی اور خوش کلامی ایسے عنوانات قائم کیے جا سکتے ہیں اور ایک ایک عنوان کو مناسب شرح و بسط سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

اگر ہم عزم و استقلال، حسنِ معاملت، عدل و انصاف، شرم و حیاء، شجاعت، صداقت و امانت، رحمت و محبت، سادگی و بے تکلفی، ایفائے عہد، مہمان نوازی، جُود و سخا، مداومتِ عمل، حسنِ صورت و حسنِ سیرت، عبادت و اطاعت، بندوں اور خُدا کے حقوق کی حفاظت کو ایک شخصیت فرض کر لیں تو بلاشبہ اُس شخصیت کا نام نامی اسمِ گرامی جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ؕ

بقیہ منصبِ رسالت اور اُس کا مقصد

تکمیلِ نبوّت کے بعد اور ختمِ نبوّت کے بعد اس اتمامِ رسالت، اور تکمیلِ نبوّت اور ختمِ نبوّت کے موضوع پہ اور اس کے لوازم پہ اب اِن شاء اللہ تعالےٰ آئندہ گفتگو ہوگی، اور ساتھ ہی اس اتمامِ حجت کیلئے جو اس سطح پہ ہوئی تھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح محنت کی اور جس طرح جدّ و جہد کی ہے اور اس نظامِ اجتماعی کا نقشہ پیش کیا اور اس نظامِ اجتماعی کے نقشے کو عملاً قائم کر کے ہمیشہ ہمیش کے لئے نوعِ انسانی پہ اتمامِ حجت کر دیا ہے۔ یہ سب کچھ اِن شاء اللہ میری آئندہ کی گفتگو کا موضوع ہو گا ؛

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات

محمد یونس صاحب جنجوعہ ایم اے، ایم ایڈ

اسلام بلاشبہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ نبوت اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے۔ آج مسلمان اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر تسلیم تو کرتے ہیں، لیکن خود اپنے عمل سے اس کی نفی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو وہ اسلامی تعلیمات سے واقف نہیں اور جدید علوم حاصل کر کے ان کی چمک دمک سے مرعوب ہو گئے ہیں اور مختلف نظریہ ہائے زندگی کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں یا خود اسلام کے اصولوں کو قابل ترمیم سمجھتے ہوئے اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق اسے ڈھالنا چاہتے ہیں۔ شاید انہیں یہ بات بھول جاتی ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ (خالقِ کائنات) کا پسندیدہ طرزِ زندگی ہے۔ چونکہ اللہ ربّ العزّت ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے۔ اسی طرح اس نے جو دین بنی نوعِ انسان کے لئے پسند کیا وہ بھی بے عیب ہو گا۔ نیز یہ کہ اسی اسلام کو بطورِ دین کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بالفعل نافذ کر کے مسلمانوں کے حوالے کیا۔ اور آپ کے خلفاءِ راشدین نے بھی اُس کو اپنے اپنے دورِ خلافت میں جاری رکھا اور تاریخ عالم نے دیکھا کہ امن وسکون، خوشحالی اور فارغ البالی میں وہ دور اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

آج خود مسلمان اسلام سے مطمئن نہیں۔ لاتعداد فرقے پیدا ہو چکے ہیں جو اسلام کے چہرے پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دی جائے تو وہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ اسلام کے کس فرقے میں شامل ہوں۔ یہ صورتِ حال اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ خود مسلمان مختلف اغراض و مقاصد کے حصول میں اس حد تک منہمک ہو گئے کہ اسلامی تعلیمات سے سرچشموں

کو فراموش کر بیٹھے۔ اسلام میں ذاتی پسند کی چیزوں کو داخل کر دیا اور اس طرح مسخ شدہ اسلام کے حامل بن کر ہر قسم کی برکات سے محروم ہو گئے۔

قرآن حکیم میں جو اسلامی تعلیمات کا اوّلین ماخذ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقہ بندی نہ کرو!" مسلمانوں نے فرقہ بندی کر کے حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی کی۔ چنانچہ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کسی نہ کسی فرقے سے متعلق ہے اور وہ اپنے مخصوص فرقے کو ہی اسلام سمجھتا ہے حالانکہ اس کی غلطی واضح ہے۔ صحابہ کرامؓ صرف مسلمان تھے، اُن کا کوئی فرقہ یا ٹولہ نہ تھا۔ انہوں نے اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اُن کے سامنے رسولِ پاکؐ کا فرمان موجود تھا:

"میں تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ جب تک تم ان کو اختیار کئے رکھو گے گمراہ نہ ہو گے۔ ایک کتاب اللہ دوسری میری سنّت!"

صحابہ کرامؓ نے قرآن و سُنّت کے اتباع کی جو مثالیں قائم کی ہیں وہ اسلامی تاریخ کے درخشندہ باب ہیں لیکن یہاں طوالت کی خاطر اس سے صرفِ نظر کیا جا رہا ہے۔

خلفائے راشدین کے بعد کے لوگوں کے لئے آپؐ نے ارشاد فرمایا: "تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے پر چلو اور خلفائے راشدین کی راہ اختیار کرو!" اللہ تعالیٰ کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے خلفائے راشدین پر کہ جنھوں نے پیغمبرِ اسلامؐ کے اعتماد کو ذرّہ برابر ٹھیس نہ پہنچائی اور اپنے زمانے میں سُنّتِ نبوی پر سختی سے عمل پیرا رہے اور ایسی کسی چیز کو اسلام میں داخل نہ کیا جو آنحضرتؐ نے اسلام میں شامل نہ کی تھی اور اس طرح خلفائے راشدین بھی دینِ اسلام کو خالص حالت میں چھوڑ کر رخصت ہوئے۔

اُصولی طور پر تو اسلام کی تکمیل بطورِ ضابطۂ حیات خود ربّ العزّت نے فرما دی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری ایّام میں یہ اعلان کیا گیا کہ: "آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمّل کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو بطورِ دین (ضابطۂ حیات) پسند کیا!" یوں اللہ تعالیٰ نے ضابطۂ حیات مکمّل اور تمام

صورت میں مرحمت فرمایا اور پیغمبر اسلام ؐ نے اس کو نافذ کیا۔ لیکن امّت کی بدقسمتی کہ نظری طور پر تو دین کو مکمّل ضابطۂ حیات تسلیم کیا مگر اس کی سادگی، سہولت اور خلوص کو قائم نہ رکھا۔ پیچیدہ رسمیں، مشکل ریاضتیں اور عجیب و غریب بدعات خود اپنی طرف سے گھڑ کر انہیں دین کا اہم جزو قرار دیا۔ اور یوں بالفعل یہ ظاہر کیا کہ اسلام جو رسول ؐ اور اُس کے اصحاب نے پیش کیا وہ مکمّل نہ تھا۔ بلکہ ابھی اُس میں بہت سی باتوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ پس مسلمانوں کی اجتماعیّت کے لئے اُصولوں سے انحراف زہرِ قاتل ثابت ہوا اور ہوتا تھا۔ اس طرح مسلمانوں میں خود دو گروہ پیدا ہو کر حق و باطل کی طرح ٹکرانے لگے ——————!!

کاش! مسلمان قرآنی تعلیمات کو فراموش نہ کرتے اور اسلام کو اس کی خالص شکل میں رکھتے اور فرمانِ نبوی ؐ کو قولِ فیصل جانتے تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

"اگر کسی بات میں تمھارا جھگڑا ہو جائے تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ — یعنی وہاں سے رہنمائی حاصل کرو!"

ہر مسلمان یہ جانتا ہے کہ تکمیل دین کی آیت کے نزول کے وقت اور خلفائے راشدین کے مبارک ادوار میں صحابہ کرام ؓ کی قبریں کچّی تھیں۔ نہ ان کو غسل دیا جاتا تھا۔ نہ اُن پر غلاف چڑھائے جاتے تھے۔ نہ وہاں پیسے ڈالنے کے لئے صندوق ہوتے تھے۔ نہ وہاں روشنی کی جاتی تھی۔ نہ اُن پر گنبد بنائے جاتے تھے۔ نہ درگاہیں تعمیر ہوتی تھیں۔ نہ متولّی بیٹھتے تھے۔ نہ عرس ہوتے تھے نہ میلے۔ البتہ قبروں پر جا کر اپنی موت کو یاد کرنا اور فوت شدہ لوگوں کے حق میں دعائے مغفرت کرنا معمول تھا۔ خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم قبرستان میں تشریف لے جاتے اور مُردوں کے حق میں دعائے مغفرت فرماتے۔ مگر حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ منع فرمایا ہے رسول اللہ ؐ نے قبروں کو پختہ بنانے سے، اُن پر عمارت بنانے سے، اور اُن پر بیٹھنے سے۔ نیز آپ ؐ نے فرمایا: "اللہ کی لعنت ہے قبروں پر چراغ جلانے والوں پر!" آپ ؐ

کے ان فرامین پر عہدِ نبویؐ میں عمل رہا اور خلافتِ راشدہ میں بھی قبروں پر گنبد تعمیر نہ کئے گئے۔ یہی چیز کتبِ تواریخ سے ثابت ہے۔ اب مسلمانوں کا عمل ملاحظہ ہو کہ آنحضرتؐ کے اُسوہ اور خلفائے راشدین کے طریقہ کے خلاف قبریں پختہ بن رہی ہیں، اُن پر گنبد بنائے جا رہے ہیں، درگاہیں تعمیر ہو رہی ہیں، متولی بیٹھے ہیں، عرس اور میلے ہو رہے ہیں، قبروں کو غسل دیا جا رہا ہے، غلاف چڑھائے جا رہے ہیں اور وہاں منتیں مانی جا رہی ہیں۔

یہ ایک مثال ہے، علاوہ ازیں بدعات کا ایک وسیع سلسلہ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو میں شامل ہے اور سُنّت کے متوازی ایک دوسرا سلسلہ قائم ہے بچے کی پیدائش کی رسومات۔ وفات پر مختلف ناموں پر اجتماع ــــ نکاح کے موقعہ پر فضول رسمیں اور اُسوۂ حسنہ کی خلاف ورزی، شب برات، معراج شریف اور لیلۃ القدر کے خود ساختہ پروگرام، میلاد النبیؐ کے نام پر عید۔ الغرض اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات قرار دینے والے خود نئی نئی چیزیں دین میں شامل کر رہے ہیں اور علمائے حق کا وہ گروہ جو اُن کی اِن بدعات کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور دین کو اُسوۂ رسولؐ اور عملِ صحابہؓ کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے اُسے بُرا بھلا کہتے ہیں۔ حالانکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے ہمارے اس دین میں ایسی کوئی نئی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے پس وہ مردود ہے۔ نیز "سب سے بہتر بات خدا کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ اور بدترین چیز وہ ہے جو دین میں نئی پیدا کی گئی ہو اور ہر بدعت گمراہی ہے"۔ بدعت کو آپؐ نے اس لئے بدترین عمل قرار دیا کہ دین میں اضافہ جائز سمجھنے والا دراصل تکمیلِ دین کی نفی کر رہا ہے۔ وہ اپنے ناقص ذہن کے ساتھ دین کو مکمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے، حالانکہ ربّ العزت اُسے مکمل کر چکا ہے۔ بظاہر بدعات کو مزین کر کے پیش کیا جاتا ہے مگر یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ اس سے دین کی سادگی اور سہولت پر زد پڑتی ہے، اور دین میں سادگی اور سہولت منتہائے خداوندی ہے "اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے تمہارے لئے آسانی کا اور نہیں چاہتا تمہارے لئے تنگی ــــ!!

دین میں بدعات کے وجود کو صحیح تسلیم کرنے والے کہتے ہیں کہ ان چیزوں سے ہمارا مقصود قربِ الٰہی کا حصول ہے۔ یعنی ہماری نیت نیک ہے۔ لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ قربِ الٰہی کے حصول کے جو طریقے مناسب اور بھلے تھے وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھلا دیئے ہیں اور کسی دوسرے کے لئے اس میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ؛

قرآنِ پاک میں بدعت کی مذمت سورۃ الحدید میں مذکور ہے۔ یہ بات نیت اسلام میں نہیں ہے۔ لیکن نصاریٰ نے دنیا کی شہوات اور لذائذ سے کنارہ کشی کرنے کے لئے حسنِ نیت پر ترکِ دُنیا اختیار کیا۔ اس طرح وہ گناہ سے بچنے کا اہتمام کرنے لگے۔ گناہ سے بچنے کا یہ اہتمام چونکہ فطرت کے تقاضوں سے متصادم تھا، لہٰذا وہ لوگ اس پر قائم نہ رہ سکے اور اپنی حُسنِ نیت کے باوجود غضبِ الٰہی کے سزاوار ہوئے، بفحوائے الفاظِ قرآنی :

"اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کر لی۔ ہم نے ان پر فرض نہ کی تھی مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انہوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا!"..... (۵۷ : ۲۷)

اگر رہبانیت بذاتہٖ کوئی اچھی چیز ہوتی تو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام میں داخل کر دی جاتی۔ معلوم ہوا کہ بدعت کا آغاز اللہ کی خوشنودی کی خاطر ہی ہوتا ہے، مگر بدعت انسانی ذہن کی پیداوار ہونے کی وجہ سے ناقص ہوتی ہے اور ایجاد کرنے والے اس میں پیدا ہونے والی قباحتوں کو روک نہیں سکتے۔ بدعت کا انجام کے اعتبار سے ناقص ہونا اسی بات سے ظاہر ہے کہ اُسے علّام الغیوب نے خود دین میں شامل نہیں کیا۔ ہر وہ عبادت بدعت کہلائے گی جس کی ادائیگی کی نظیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دور میں نہیں ملتی ——— !!

کاش ! کہ مسلمان اسوۂ رسولؐ اور خلفائے راشدینؓ کے طریقے کو اپنائیں۔ آسان اور سہل دین پر عمل کریں اور اسلامی عبادات میں اضافے کر کے منصبِ رسالت میں مداخلت کی جسارت نہ کریں ؛

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

تصانیف : امام حمید الدین فراہیؒ

- مجموعۂ تفاسیر فراہیؒ — ہدیہ -/۲۴ روپے
- اقسام القرآن — اردو ترجمہ الامعان فی اقسام القرآن — " ۳/۷۵ "
- ذبیح کون ہے؟ — اردو ترجمہ القول الصحیح فی من ہو الذبیح — " ۴/۵۰ "

مترجم مولانا امین احسن اصلاحی

تصانیف: مولانا امین احسن اصلاحی

سلسلۂ تدبر قرآن :-

- مبادیٔ تدبر قرآن : تدبر قرآن کے اصول و قواعد پر اہم دستاویز — ہدیہ -/۸ روپے
- مقدمۂ تدبر قرآن و تفاسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ — " -/۳ "
- تدبر قرآن جلد اوّل مشتمل بر مقدمہ و تفسیر از ابتداء تا سورۂ آل عمران — " -/۵۰ "
- تدبر قرآن جلد دوم مشتمل بر تفسیر سورۂ نساء تا سورۂ اعراف — " -/۵۰ "
- تدبر قرآن جلد سوم مشتمل بر تفسیر سورۂ انفال تا سورۂ بنی اسرائیل — " -/۵۰ "
- تدبر قرآن جلد چہارم مشتمل بر تفسیر سورۂ کہف تا سورۂ قصص — " -/۵۰ "
- حقیقت دین مشتمل بر حقیقت شرک حقیقت توحید حقیقت تقوی حقیقت نماز — " -/۲۰ "
- دعوت دین اور اس کا طریق کار — " -/۱۰ "
- اقامت دین کے لئے انبیاء کرام کا طریق کار — " ۱/۲۵ "
- قرآن اور پردہ — " -/۱ "
- اسلامی قانون کی تدوین — " -/۵ "
- اسلامی ریاست — " -/۲۰ "
- پاکستانی عورت دوراہے پر — " [illegible] "

تصانیف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدعا اور طریق کار قسم اعلیٰ ۱/۵۰ قسم ادنیٰ ہدیہ ۱/ روپے

تصانیف: ڈاکٹر اسرار احمد

—— اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام	ہدیہ -/۱ روپے
—— مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (اُردو)	" -/۲ "
—— " " " (انگریزی)	" -/۳ "
—— " " " (عربی)	" -/۴ "
—— عظمت صوم	" -/۱ "
—— علامہ اقبال اور ہم	" ۱/۵۰ "
—— راہ نجات: سورۃ والعصر کی روشنی میں	" -/۲ "
—— قرآن اور امن عالم	" ۷۵/- "
—— دعوت الی اللہ	" -/۱ "
—— آیۃ الکرسی: ایک نشری تقریر	" ۳۰/- "
—— درس قرآن حکیم کا منتخب نصاب حصہ اول و دوم فی جزء	" -/۵ "
—— حج اور عیدالاضحیٰ اور ان کی اصل رُوح	زیر طبع
—— نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت	ہدیہ -/۳ روپے
—— قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ (الفاتحہ تا الکہف)	" -/۳ "

تالیف: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش ہدیہ -/۵ روپے

تالیف: سید غلام احمد رضوی ایڈووکیٹ

یتیم پوتے کا حق وراثت ہدیہ -/۵ روپے

Regd.L. No. 7360

MONTHLY MEESAQ LAHORE

Vol. 28 | October 1979 | No. 10

احباب کے شدید تقاضے پر

سیرت و تاریخ کے موضوع پر

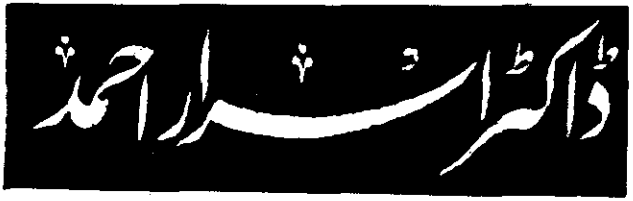

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیم اسلامی ، کی

۱۰ تقاریر کے TAPES

C-90 کے گیارہ CASSETTES کے SETS کی صورت میں تیار کرا لیے گئے ہیں ۔

جن کی بڑی تعداد پیشگی قیمت جمع کرانے والے حضرات کو دی جا چکی ہے اور اب صرف ایک محدود تعداد دستیاب ہے ۔

ہر سیٹ کی قیمت صرف لاگت کے مطابق -/۲۷۵ روپے ہے بذریعہ ڈاک منگانے والوں کو پانچ روپے محصول ڈاک خرچ کرنا ہوگا ۔

منگانے کا پتہ

ناظم اعلیٰ ، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ ۔ کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور

(فون : 852683 – 812611)

پرنٹر : چوہدری رشید احمد — مطبع : مکتبہ جدید پریس ۔ شارع فاطمہ جناح لاہور